Registered No. L. 5340

جلد ۹

عدد ۱

ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ:

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے	برائے پاکستان	قیمت فی پرچہ آٹھ آنے
,, سات روپیہ آٹھ آنے	برائے ہندوستان	,, گیارہ آنے

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

فہرست مضامین

جلد ۲۹ | رجب ۱۳۶۵ھ مطابق جون ۱۹۴۶ء | عدد ۱

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ. لاہور میں چھپوا کر دار الاسلام پٹھانکوٹ (پنجاب) سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

حضرات انبیائے کرام اور داعیان حق جس مقصد کو لے کر اٹھتے ہیں وہ ایمان کی دعوت ہے۔ ایمان کوئی منفی چیز نہیں ہے بلکہ ایک مثبت حقیقت ہے۔ اس کا عملی فائدہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب یہ پوری طرح دل میں راسخ ہو۔ یہ استحکام و رسوخ پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد نہایت پائیدار اور محکم استدلال پر ہو۔ اس کے بغیر نہ تو یہ ایمان زندگی کے لیے ایک محرک کا کام دے سکتا، نہ اس سے تمام اعتقادی و عملی جزئیات وجود میں آ سکتیں، نہ یہ زندگی کے وسیع الاطراف گوشوں میں انسان کی نگرانی کر سکتا۔ اس وجہ سے داعیان حق کا کام نہ تو مجرد تحکم سے چل سکتا، نہ مغالطہ سے وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتے، نہ الزامی قسم کے دلائل ان کے کام آ سکتے، نہ محض شاعرانہ اور خطیبانہ قسم کا استدلال، جو فطرت اور عقل کے اندر اپنی کوئی اساس نہ رکھتا ہو، ان کے مقصد کو پورا کر سکتا۔ اس طرح کے سفسطہ اور الزامی و خطابی طرز استدلال سے وہ لوگ تو بے شک اپنا کام نکال سکتے ہیں جن کے پیش نظر صرف مخاطب کو ساکت کر دینا یا اس کو مغالطہ میں ڈال کر اپنا کوئی مقصد حاصل کر لینا ہو لیکن جن کے سامنے مخاطب کو چپ کرنا نہیں، بلکہ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو صحیح راہ پر چلنے کے لیے بیدار کرنا ہو، اور جن کا مقصد لوگوں کو مسحور یا مرعوب کر کے کسی راہ پر ہانک دینا نہیں، بلکہ ان کی فطرت اور عقل کو اس طرح جگا دینا ہو کہ مشکل سے مشکل راہوں میں ہر شخص خود اپنی رہنمائی کر سکے وہ اولاً تو استدلال کی ان قسموں کو سرے سے ہاتھ ہی میں نہیں لگاتے اور اگر لگاتے ہیں تو اس امر کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے ہیں کہ ایک پاک اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وسائل و ذرائع بھی نہایت پاک اور اعلیٰ ہوں۔ اس چیز نے انبیائے کرام اور داعیان حق کے طرز استدلال کو دوسروں کے طرز استدلال سے بالکل ممیز کر دیا ہے جس کی بعض نمایاں خصوصیات کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

۱- استدلال ہوا اور پانی کی طرح ایک عام ضرورت کی چیز ہے۔ ہر انسان زندگی کو صحیح طور پر بسر کرنے کے لیے ایمان کا محتاج ہے اور محکم ایمان بغیر محکم استدلال کے حاصل نہیں ہو سکتا اس وجہ سے استدلال کے لیے دو باتیں ضروری ہیں پہلی یہ کہ استدلال کا طریقہ اتنا فطری اور سادہ ہو کہ ہر شخص جس طرح اپنی ضرورت کے مطابق زمین اور فضا کے ذخیرۂ آب و ہوا سے ہوا اور پانی حاصل کر لیتا ہے اور اس میں اس کو کوئی خاص دقت نہیں پیش آتی اسی طرح ہر شخص زمین و آسمان کے آثار و آیات سے اپنے اطمینان قلب کے لیے جس قدر چاہے دلیلیں پیدا کر لے اور اس میں اس کو تفکر و تذکر کے سوا کسی اور چیز کا اہتمام نہ کرنا پڑے۔ دوسری یہ کہ جس طرح انسان کی جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے کہ جس پانی کو وہ پی رہا ہے وہ صاف ہو اور جس ہوا میں سانس لے رہا ہے وہ تازہ ہو اسی طرح اس کی عقلی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس استدلال سے اصول زندگی حاصل کر رہا ہے وہ بالکل بے آمیز خالص اور پاک ہو۔ ان دونوں باتوں کو حاصل کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام اور داعیان حق کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ انھوں نے ایک طرف تو استدلال و حجت کے ان مصنوعی طریقوں سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی جو کسی قوم میں علمی و فنی ترقیوں سے پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک خاص پیشہ ور گروہ کے سوا دوسرے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ دوسری طرف اس تمام مواد کا انھوں نے جائزہ لیا جو استدلال و حجت کے لیے کام میں لایا جاتا ہے اور اس میں سے چھانٹ کر صرف اس چیز کو اپنے حجت و استدلال کے لیے کام میں لائے ہیں جو ہر قسم کی غیر فطری ملاوٹ سے پاک ہو۔ اس طرز استدلال کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا ایک انبوہ عظیم جو اس سے پہلے بالکل اندھا بہرا بنا ہوا گنتی کے چند انسانوں کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے دفعۃً اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے لگتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک سڑے گلے مواد استدلال کے نگلتے رہنے کی وجہ سے دلوں اور روحوں پر جو مردنی طاری رہتی ہے اس صالح مواد استدلال کے چند لقمے حلق سے اتارتے ہی دفعۃً دور ہو جاتی ہے اور کھانے والا اپنے آپ کو بالکل چاق و چوبند محسوس کرنے لگتا ہے۔

داعیان حق اور انبیائے کرام کے طرز استدلال کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے عقل انسانی ان کے زمانے میں کروٹ لیتی ہے اور ایک عام ذہنی بیداری ہر گوشہ میں نمودار ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ان

گوشوں میں بھی ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے جہاں سے کسی اچھی خبر کی کسی کو بھی امید نہیں ہوتی۔ ہر طرف تنقید کی نگاہیں کھل جاتی ہیں۔ ہر آنکھ دیکھنے اور ہر زبان بولنے لگتی ہے۔ فکر و استدلال کے پرانے طریقے جو اب تک نہایت محبوب تھے فرسودہ اور دقیانوسی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور بہت سی ایسی چیزیں جن کو ہر شخص ماخذ استدلال و حجت بنائے بیٹھا تھا، بالکل بے مصرف اور بے وقعت ہو جاتی ہیں۔ یہ ذہنی انقلاب ان لوگوں پر بہت گراں گزرتا ہے جو .... اپنی قدیم محبوبات و مالوفات کو حق سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ اس میں مزاحمت پیدا کریں لیکن نہ اس چیز کو روکا جا سکتا نہ اس کو روکنا صحیح ہے۔ البتہ جس چیز کی نگرانی کی ضرورت ہے وہ یہ چیز ہے کہ جو ذہنی آزادی پیدا ہو رہی ہے اس کا بہاؤ صحیح رخ پر ہو۔ اس میں بے اعتدالی اور مطلق العنانی نہ پیدا ہونے پائے۔

۲۔ انبیاء اور اہل حق کے طرز استدلال کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف دلیل نہیں دیتے بلکہ مخاطب میں استدلال کی قابلیت بھی پیدا کرتے ہیں۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں جس ہمہ گیر انقلاب کی دعوت لے کر آتے ہیں وہ انقلاب اس وقت تک پائیدار بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہ انسان کی فکری و نظری صلاحیتوں کو پوری طرح جگا نہ دیں۔ زندگی کوئی مفرد اور بسیط چیز نہیں ہے جس کو صحیح طور پر گزار دینے کے لیے چند گنے چنے اصولوں کی رہنمائی کافی ہو سکے۔ یہ گوناگوں ظاہری و باطنی مطالبات و مقتضیات کا مجموعہ، بے شمار انفرادی و اجتماعی روابط و علائق کا شیرازہ، ان گنت شخصی، عائلی اور قومی حقوق و فرائض کا ایک گنجینہ ہے۔ پھر وہ پوری کی پوری ہماری نظروں کے سامنے موجود بھی نہیں ہے کہ ہر شخص کی گرفت میں آ سکے اور تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں اس کی ہر حالت کے لیے پہلے سے ایک حکم معین ہو سکے۔ بلکہ اس کا ماضی اور مستقبل دونوں غیب کے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ صرف تھوڑا سا حاضر ہے جس کے، اشارات کی روشنی میں اس کے ماضی کو بھی جانتا ہے اور اسی کی رہنمائی سے اس کے مستقبل کو بھی معین کرتا ہے۔ ایسی حالت میں زندگی کی رہنمائی کے لیے قانون و آئین کے متعین و محدود ضابطے کافی نہیں ہو سکتے، بلکہ ضروری ہے کہ اس ضابطہ کے ساتھ انسان کے اندر فکر صالح کی ایک ایسی کبھی نہ بجھنے والی روشنی

بھی ہو جو زندگی کے ان مخفی گوشوں میں بھی اس کی رہنمائی کرے جہاں رہنمائی کے لیے اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہو۔ یہ فکرِ صالح انبیا اور اہلِ حق کے طرزِ استدلال سے خود بخود مخاطب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ انبیا جب اپنی اصولی تعلیمات کا آغاز کرتے ہیں تو اس کی طرح ہی اس طرح ڈالتے ہیں کہ اس فکرِ صالح کی تخم ریزی کے لیے خود بخود دلوں اور روحوں کے اندر زمین بھی ہموار ہو جاتی ہے اور اس کے بیج بھی پڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہیں تو ایک طرف تو شریعت کا ایک شاداب باغ تیار موجود ہوتا ہے جو ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور دوسری طرف حکمت کا ایک لہلہاتا ہوا چمن بھی ذہن قلبِ صالح کے اندر اگا دیتے ہیں جو اگرچہ نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا لیکن اس کی بہار ہمیشہ قائم ...... اور اس کی شاخیں ہر موسم میں ثمر بار رہتی ہیں۔ بظاہر تو اس کی حیثیت انبیاء کی اصل تعلیم کے مقابل میں ایک ضمنی کاشت اور ضمنی پیداوار کی ہے لیکن اپنی قدر و قیمت اور اپنے بیش بہا فوائد کے اعتبار سے یہ اصل کے برابر جگہ پاتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مجھے قرآن دیا گیا اور اسی کے مثل اس کے ساتھ ایک اور چیز" اسی شجر مبارک کے پھل پھول ہیں جو ہمیں احادیث کی صورت میں ملے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "جس کو یہ چیز ملی اس کو خیر کثیر کا خزانہ ملا"۔ اسی کی نسبت قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "صرف نصیبہ ور لوگ ہیں جن کو یہ چیز ملتی ہے"۔ اور اسی کو بعض احادیث میں ایسے خزانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

یہ تخلیقی صفت صرف اہلِ حق اور حضرات انبیائے کرام کے طرزِ استدلال کے ساتھ مخصوص ہے کسی مناظر اور متکلم کے استدلال میں یہ چیز آپ کو نہیں مل سکتی۔ منطقی طرزِ استدلال اس پہلو سے سب سے زیادہ ناقص ہے۔ منطق کو زیادہ سے زیادہ جو عزت دی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک استدلال کو اپنی کسوٹی پر جانچ کر وہ بتا سکتی ہے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں۔ استدلال کی قابلیت پیدا کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔ اور یہ کام بھی منطق سے صرف ایک خاص حد ہی تک لیا جا سکتا ہے۔ قرآن میں اور انبیاء کے کلام میں ہم کو استدلال کی ایسی نازک قسمیں بھی ملتی ہیں جن کو منطق کی ترازو پر سرے سے تولا ہی نہیں جا سکتا لیکن ہمارے

متکلمین جنھوں نے منطق کو اس کی حیثیت سے زیادہ درجہ دیا، کوڑ تولنے کی اس ترازو سے ان اشرفیوں کو بھی تولنا چاہا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اشرفیوں کی صحیح قدر و قیمت معلوم نہ ہو سکی اور ان کو وہ کوئلوں سے بھی کم تر قرار دے بیٹھے۔

ل

اہل فلسفہ فکر انسانی کو اس بات کی ٹریننگ تو ضرور دیتے ہیں کہ وہ استدلال و استنباط کے مختلف میدانوں میں جولانی کر سکے لیکن انھوں نے اپنے مواد استدلال، طرز استدلال اور ذرائع استدلال تینوں کو رطب و یابس کا مجموعہ بنا دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے طریقہ پر سوچنے والا انسان حیرانی و سرگشتگی کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکتا۔ ان کی رہنمائی میں اگر انسان چند قدم صحیح راہ میں اٹھاتا ہے تو ساتھ ہی مجبور ہوتا ہے کہ چند قدم غلط سمت میں بھی اٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی مختلف وادیوں کی آوارہ گردی اور اٹکل کے تیر تکے چلانے میں گذر جاتی ہے اور چند متناقض و متضاد الجھے ہوئے افکار کے سوا اس کے لیے کچھ نہیں پڑتا۔ اس معاملہ میں فلسفہ قدیم ہو یا فلسفہ جدید سب کا حال یکساں ہے۔ سب کے اصول فکر میں الجھاؤ اور ہر ایک کے نتائج فکر میں پریشانی ہے۔ اور اب کہ سائنس کی ترقیوں نے سارا مدار تجربہ و مشاہدہ پر قائم کر دیا ہے اور انسان اس خبط میں مبتلا ہو گیا ہے کہ دل و دماغ کی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے وہ سب کچھ سر کی آنکھوں سے دیکھ کر مانے گا، کوئی توقع ہی اس بات کی باقی نہیں رہ گئی کہ اس کا ایک قدم بھی جادہ مستقیم پر پڑے گا۔ اب تک فلسفہ کی بنا جن اصولوں پر تھی ان میں سے بعض غلط تھے تو بعض صحیح بھی تھے جس کی وجہ سے اس کے خوابہائے پریشاں میں سے بعض خواب سچے بھی ہو جاتے تھے اور آدمی کے لیے صرف سچے اور جھوٹے میں امتیاز کی مشکل تھی لیکن اب تو سارا تکیہ حس و مشاہدہ پر رہ گیا ہے اور حس و مشاہدہ کی جہانگیری معلوم ہے کہ وہ کہاں تک ہے۔ اس کے سوا آج اگر کوئی چیز فلسفہ کے نام سے موجود ہے تو وہ اہل تشکیک کا فلسفہ ہے جس کی ساری بنیاد حواس و عقل کی بے اعتباری پر قائم ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی فلسفہ نہیں بلکہ تمام علم و فلسفہ کی کلی نفی ہے۔ اور دنیا کو حیرانی کے سوا اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

حضرات انبیاے کرام کا طریقہ استدلال نہ اہل منطق کے طریقہ کی طرح بانجھ ہے اور نہ اہل فلسفہ کے طریقہ کی طرح پریشان کن۔ بلکہ وہ فکر انسانی کی اس طرح تربیت کرتے ہیں کہ وہ خود بخود صحیح راہ پر چلنے لگے اور منزل مقصود کا سراغ ...... اس کے اندر یہ یقین پیدا کر دے کہ اس نے جو راہ اختیار کی ہے وہ صحیح ہے۔ وہ پہلے تو ماخذ استدلال کی طرف توجہ دلاتے ہیں، یعنی آفاق و انفس کی طرف۔ آفاق سے مراد نظام کائنات کے آثار و آیات اور قوانین و ضوابط ہیں جو اس دنیا میں ہر شخص کو بادنیٰ توجہ نظر آتے ہیں۔ نفس سے مراد وہ قوتیں اور قابلیتیں اور وہ یقینیات ہیں جن کو ہر انسان اپنے اندر دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ ان میں سے نمایاں چیزوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں اور ان سے جو باتیں لازم آتی ہیں ان کو پیش کرتے ہیں۔ یہ پیش کرنا کبھی تو ایسی تصریح کے ساتھ ہوتا ہے کہ پوری بات بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اور کبھی تربیت کے خیال سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ لازمی نتیجہ کی طرف صرف اشارہ کر دیا جاتا ہے تاکہ مخاطب خود اس نتیجہ تک پہنچے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب میں صحیح نتائج نکالنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے جو زندگی کے سفر میں ہر مرحلہ میں اس کے کام آتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ اس کو دوسرے کی بات سمجھ کر اس کی تردید یا انکار کے درپے نہیں ہوتا بلکہ اس کو خود اپنا نتیجہ فکر سمجھ کر اس کو قبول کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح مخاطب و متکلم میں استاذ و شاگرد کے بجائے باہم گر رفیق کی نسبت پیدا ہو جاتی ہے اور مخاطب میں یہ احساس کمتری نہیں پیدا ہوتا کہ میں اس نتیجہ تک دوسرے کی انگلیاں پکڑ کے پہنچا ہوں بلکہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہم دونوں مشترک طور پر اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ یہ باتیں مقصد دعوت کو اتنے مختلف پہلوؤں سے فائدہ پہنچاتی ہیں کہ ان کی تفصیل کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں ہے کہ استدلال کی ساری قسموں میں فطرت انسانی سے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی قسم یہی لوازم سے استدلال کی قسم ہے۔ اس وجہ سے اہل حق اور حضرات انبیاے کرام نے اس کو سب سے زیادہ برتا ہے۔ آدمی جب ایک امر کا آفاق میں مشاہدہ کرتا ہے یا اپنی

فطرت کے اندر اس کا یقین محسوس کرتا ہے تو جو باتیں اس سے لازم آتی ہیں ان کا انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ صحیح ترتیب کے ساتھ اس کے سامنے پیش کی جائیں۔ اگر انکار کرے گا تو محض زبان سے انکار کرے گا، اس کا دل اس کے اس انکار کا ساتھ نہ دے گا۔ اور اس انکار پر اس کے لیے زیادہ دن تک جمے رہنا صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب وہ کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم ہو۔ ایک امر کے لوازم کی حیثیت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوتی ہے اور ہر آدمی سے جس میں حق پرستی اور سچائی کی کوئی رمق باقی ہے، یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس بات پر مجملاً ایمان رکھتا ہے اس کی تفصیلات اور لوازم سے گریز نہ کرے گا۔ جن لوگوں نے قرآن مجید کے دلائل پر غور کیا ہے وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کے بیشتر دلائل کی نوعیت یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو شخص قرآن، اپنے دل کو ہر طرح کے تعصبات سے پاک کر کے پڑھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی صحیفۂ دل کی تلاوت کر رہا ہے اور اس کی ہر صدا اسے اپنے ہی ضمیر و دل کی آواز کی طرح سے مانوس معلوم ہونے لگتی ہے۔

۳۔ اہل حق اور انبیائے کرام کے طرز استدلال کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام اہل مناظرہ کی طرح مخاطب کے کسی غلط مسلمہ کو بنائے استدلال نہیں بناتے۔ اگر ایک شخص ایک غلط بات کو مان رہا ہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے نہ کہ اس کی اس غلطی کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ چند اور غلطیوں کو بھی تسلیم کرے۔ جو لوگ اپنے مخاطب کو صرف خاموش کر دینے کا شوق رکھتے ہیں، یا اس کو اپنی بات کے آگے جھکانا چاہتے ہیں یا اس کو کسی مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، ان کے استدلالی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت اسی چیز کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اہل حق اس چیز سے اس حد تک گریز کرتے ہیں کہ اگر مخاطب کے کسی غلط مسلمہ پر اپنے کسی حق کو بھی ثابت کر سکتے ہوں جب بھی وہ ایسا نہیں کرتے۔ ان کی نظروں میں اس حق کی کوئی وقعت نہیں ہے جس کی بنیاد کسی باطل پر ہو۔ اس طرح کا کھوکھلا اور بے اساس حق مناظرہ کی مجلسوں میں ممکن ہے کچھ دیر کے لیے ذہنی چمک دمک دکھا دے لیکن زندگی کی مہمات میں یہ کچھ کام نہیں دیتا۔ زندگی کی مہمات میں صرف وہ

حق کام دیتا ہے جس کی .... جڑیں فطرت انسانی کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں اور اس کی وسعتوں کا یہ حال ہو کہ تمام فضا اس کے برگ و بار میں چھپ جائے۔ ہمارے متکلمین نے بالعموم یہ غلطی کی ہے کہ اسلام کے کسی اصول کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے جب انھیں اپنے گھر کی کوئی دلیل نہیں ملی تو انھوں نے دوسروں کے کسی نظریہ اور واہمہ کو اساس بنا کر اس پر اپنے مزعومات کی عمارت کھڑی کر دی۔ اس طرح کی غلط وکالت سے اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے اس قدر اسلام کے مخالفین کی مخالفتوں سے اس کو نہیں پہنچا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے کسی اصول کو صحیح عقلی و فطری دلائل سے نہ ثابت کر سکنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ خدانخواستہ اسلام اپنے اصولوں کی سچائی کے عقلی و فطری دلائل نہیں رکھتا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حضرات غیر فطری عقلیات سے اپنا مذاق اس قدر بگاڑ چکے تھے کہ اسلام کی عقلیت کی قدر و قیمت کو یہ پہچان ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے صحیح راہ یہ تھی کہ خواہ مخواہ کو اسلام کی وکالت کا ذمہ نہ لیتے بلکہ اپنے جن مشغلوں میں مشغول تھے ان میں مشغول رہتے لیکن دین آبا کی حیثیت سے اسلام کے لیے ان کے دلوں میں جو عصبیت تھی وہ انھیں مجبور کرتی تھی کہ وہ جس دین کا نام لیتے ہیں عقلی اصولوں پر اس کی سچائی ثابت کریں۔ اسلام کی عقلیت ان کے فساد مذاق اور قرآن سے محرومی کی وجہ سے ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی تھی اس وجہ سے وہ مجبور ہوئے کہ اسلام کو اس عقلیت کے معیار پر پورا ثابت کر دیں جو ان کے زمانوں میں مقبول عام و خاص ہے۔ ان کی اس غلط کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی محکم اور سچی تعلیمات کی ساری عمارت اس کی اپنی چٹان سے زیادہ مضبوط بنیادوں سے ہٹا کر دوسروں کی بالکل کمزور اور بھس بھسی بنیادوں پر کھڑی کر دی گئی۔ ان حضرات نے یہ کوشش کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہو لیکن اس کے نتائج نہایت ہی خطرناک نکلے۔ زمانہ کے امتداد اور افکار و حالات کے انقلاب نے جب وہ نظریات بے حقیقت ثابت کر دیے جو کل تک مقبول عام تھے تو اس کی زد لازماً اسلام کے ان اصولوں پر بھی پڑی جن کو ان غلط نظریات پر ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس طرح ہمارے متکلمین کی بدولت اسلام کے متعلق بہتوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس طرح وہ نظریات پرانے ہو گئے اسی طرح اسلام بھی پرانا ہو گیا۔ یہ سوءِ ظن پیدا کرنے میں جس طرح ہمارے پرانے متکلمین نے حصہ لیا ہے اسی

طرح ہمارے متکلمین نے بھی اس میں حصہ لیا ہے اور اس میں بنیادی غلطی جو چھپی ہوئی ہے وہ یہی ہے کہ حق کی حمایت کے لیے ان لوگوں نے حق کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے لیے باطل کا تعاون ضروری سمجھا۔ حالانکہ حق کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ ثابت اور محکم ہوتا ہے اور عقل و فطرت کے اندر اس کی جڑیں نہایت دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے بتائے ہوئے طریقہ فکر و استدلال کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ وہ قرآنی طرز استدلال کی باریکیوں اور خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ حالانکہ اگر وہ استدلال کی ان خلاف فطرت روشوں کو چھوڑ کر قرآن اور پیغمبر کے حکیمانہ طرز استدلال کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ قرآن کے ہر دعوی کی بنیاد ایسے محکم دلائل پر قائم ہے جو زمان و مکان کی تمام قیود و حدود اور انقلاب آراو افکار کے تمام اثرات سے بالکل آزاد ہیں۔

۴۔ داعیان حق کے طرز استدلال کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنے مخاطب کے درمیان قدر مشترک تلاش کرکے اس کو بنائے بحث و استدلال بناتے ہیں۔ ہر گوشہ میں خواہ مخواہ اپنی انفرادیت اور یکتائی کے اظہار کی کوشش نہیں کرتے۔ نوع انسانی اپنے ظاہری اختلافات کے لحاظ سے کتنی ہی بے میل، متفرق اور پراگندہ کیوں نہ نظر آئے لیکن اس کے اس تفرق اور پراگندگی کی تہ میں بے شمار اصول و عقائد ایسے بھی ہیں جن میں سب متحد ہیں۔ آفاق کے قوانین و ضوابط، تاریخ کے مسلمات، فطرت کے یقینیات اور بنیادی اخلاقیات میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں شرق و غرب اور عرب و عجم سب ایک ہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور اگر ان کو بحث و استدلال کی اساس قرار دے کر اس بات کی سعی کی جائے کہ منطقی طور پر ان اصولوں سے جو باتیں لازم آتی ہیں لوگ ان میں بھی متفق اللفظ ہو جائیں تو یہ بات ان لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو نیک نیت اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں۔ زندگی کے جو اصول مشترک ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے لوازم میں جو اختلاف ہوتا ہے وہ اکثر سوء فہم اور تقلید سے پیدا ہوتا ہے اور اس کو کوشش کرکے اگر مٹا دیا جائے تو ہر شخص ان کو مشترک ورثہ ہی کی حیثیت سے قدر و عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ حضرات انبیائے کرام نے ہمیشہ یہی طریقہ استدلال و حجت کے لیے اختیار کیا ہے۔ ذیل میں مشرکین اور اہل کتاب پر جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمام حجت فرمایا ہے اس کی تمام تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے کہیں یہ گمان نہیں گذرتا کہ ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کیا

کیا جا رہا ہے جو ان کے لیے بالکل نادر اور انوکھی ہو۔ اور ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے معروف بزرگ اور ان کے عقائد و اخلاق میں اس کی اصل موجود نہ ہو۔ اختلاف جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اصول کی تعبیر اور ان کے لوازم و نتائج میں نظر آتا ہے اور اسی کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ تھا کہ اصول وجزئیات میں جو تناقض پیدا ہوگیا ہے لوگ اس کو دور کرلیں۔ اگر وہ بات حق ہے جو قرآن مجید کہہ رہا ہے تو اس کو مان لیں اور اگر وہ بات حق ہے جس کے وہ مدعی ہیں تو اس کو صحیح ثابت کردیں۔ اس طرز استدلال کا فائدہ یہ ہے کہ داعی کے متعلق یہ بدگمانی نہیں پیدا ہوتی کہ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو اپنی انفرادیت کے زعم میں تمام ماضی پر خط نسخ پھیرنا چاہتا ہے اور اپنی شخصیت کا سکہ جمانا چاہتا ہے بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہمارے ہی اگلوں کا ورثہ ہماری طرف منتقل کرنے آیا ہے۔ اور اگر کچھ لوگ شرارت کی وجہ سے بدگمانیاں پھیلانا بھی چاہتے ہیں تو زیادہ عرصہ تک نہیں پھیلا سکتے۔ اصل حقیقت کا آفتاب نمودار ہو کر بہت جلد ان ظلمتوں کو کافور کردیتا ہے۔

جو لوگ اہل حق کے اس طرز استدلال کی خوبیوں اور فوائد سے واقف نہیں ہیں ان کا طرز عمل بالعموم اس کے بالکل ضد ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ قدر مشترک تلاش نہیں کرتے بلکہ جو قدر مشترک انھیں ملتا ہے اسے بھی نقطہ اختلاف بنا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے استدلال اور ان کی دعوت کی اصلی خوبی یہی ہوتی ہے کہ دنیا کے کان اس سے اب تک بالکل ناآشنا رہے ہیں۔ اور آسمان کے نیچے بالکل پہلی مرتبہ انھوں نے اس کو آشکارا کیا ہے۔ ہمارے مناظرین جو اسلامی دعوت کے صحیح مزاج سے واقف نہیں ہیں وہ بالعموم اس طرح کے خبط میں مبتلا ہیں۔ وہ اسلام کی کسی حقیقت کو جب بھی پیش کرتے ہیں اس کا اصلی کمال اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ اس کو نادر ترین ثابت کریں۔ یہ چیز قدرتی طور پر طبائع میں انس کے بجائے اس سے بیزاری پیدا کرتی ہے اور لوگ بجائے اس کے کہ اسے اپنی چیز سمجھ کر اس کا شوق کریں اسے اجنبی چیز سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔

۵۔ داعیان حق کے طرز استدلال کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ الزامی طریق استدلال جواب کبھی اختیار نہیں کرتے۔ الزامی طریق استدلال سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جس کو ہم اوپر استدلال باللوازم سے

عنوان سے ذکر کر چکے ہیں بلکہ اس سے ہمارا اشارہ ہمارے مناظرین اور متکلمین حال کے اس غلط طریقہ کی طرف ہے جو عموماً وہ موجودہ معترضین اور نکتہ چینیوں کے مقابل میں اسلام کی حمایت کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ ان کا مقبول عام طریقہ یہ ہے کہ جہاں کسی مذہب والے نے اسلام کی کسی بات پر اعتراض کیا وہ ...... جھٹ اسی قبیل کی مثالیں اس مذہب کی تعلیمات کے اندر سے پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے اسلام کو اعتراض کی زد سے محفوظ کر لیا۔ حالانکہ یہ بات اصولی طور پر غلط ہے دوسرے کی کسی غلطی کی بنا پر ہماری کسی غلطی کا حق ہونا تو الگ رہا ہمارے کسی حق کا حق ہونا بھی مشتبہ ہو جاتا ہے اس طریق استدلال کا فائدہ اگر کوئی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ معترض چپ ہو جاتا ہے اور اس سے ہمارے غرور نفس کو تسلی ہو جاتی ہے لیکن اس سے نہ تو مخالف کو اسلام کی حقانیت کا ثبوت ملتا نہ خود اپنے آپ کو اس سے شرح صدر حاصل ہوتا بلکہ یہ الٹے اپنی کمزوری کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ہے جو ہم خود اپنی زبان سے دوسروں کے لیے بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر امر حق اپنی دلیل خود اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کی دلیل دوسرے کے کسی باطل کے اندر نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کے دلائل خود اس کے اندر سے پیش کیے جائیں۔ اس معاملہ میں ہمارے متکلمین کی روش غلط ہونے کی وجہیں دو ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مخالفین کے پروپیگنڈے سے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے بسا اوقات اسلام کے بعض نہایت سچے اصولوں کی سچائی خود ان کی نظروں میں مشتبہ ہو گئی اور انھیں ان کی حمایت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نظر نہیں آیا کہ الزامی طریق جواب اختیار کر کے مخالف کو چپ کریں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنی وکالت وحمایت کی ذمہ داری صرف اسلام ہی کے حد تک محدود نہیں رکھی بلکہ قومی تعصب کے جذبہ کی وجہ سے انھوں نے مسلمان قوم کی پوری تاریخ کی حمایت بھی اپنے سر لے لی جس کی وجہ سے ان کا محاذ جنگ بہت لمبا ہو گیا اور انھیں بہت سی ایسی چیزوں کا حق ہونا بھی ثابت کرنا پڑا جن کو حق ثابت کرنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں تھا جب تک وہ دوسروں کے بہت سے باطل کو بھی حق ثابت نہ کر دیں۔ ہمارے متکلمین کا وہ سارا لٹریچر جو گزشتہ نصف صدی کے اندر تیار ہوا ہے اور جس میں جہاد، غلامی، تعدد ازواج، طلاق اور مسلمان سلاطین کے کارناموں کے جواز وغیرہ پر بحث کی گئی ہے وہ تمام تر اس صورت حال کی شہادت ہے اور اس کو پڑھ کر

(باقی مضمون صفحہ ۸۰ پر)

تفہیم القرآن

(۳۷)

ہود

(از رکوع ۱ تا ۵)

اس سورہ کے مضمون پر غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسی دور میں نازل ہوئی ہوگی جس میں سورۂ "یونس" نازل ہوئی تھی۔ بعید نہیں کہ یہ اس کے بعد متصلاً ہی نازل ہوئی ہو، کیونکہ موضوع تقریر وہی ہے، مگر تنبیہ کا انداز اس سے زیادہ سخت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہوتے جارہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟" جواب میں حضورؐ نے فرمایا شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا، "مجھ کو سورۂ ہود اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہ زمانہ کیسا سخت ہوگا جبکہ ایک طرف کفار عرب اپنے تمام ہتھیاروں سے اس دعوت حق کو کچل دینے کی کوشش کر رہے تھے، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پے در پے تنبیہات نازل ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں آپ کو ہر وقت یہ اندیشہ گھلائے دیتا ہوگا کہ کہیں اللہ کی دی ہوئی مہلت ختم نہ ہوجائے اور وہ آخری ساعت نہ آجائے جبکہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب میں پکڑ لینے کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ فی الواقع اس سورہ کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک سیلاب کا بند ٹوٹنے کو ہے اور اُس غافل آبادی کو جو اس سیلاب کی زد میں آنے والی ہے، آخری تنبیہ کی جارہی ہے۔

موضوع تقریر جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، وہی ہے جو سورۂ یونس کا تھا یعنی دعوت، فہمائش اور تنبیہ۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سورۂ یونس کی بہ نسبت یہاں دعوت مختصر ہے، فہمائش میں استدلال کم اور وعظ و نصیحت زیادہ ہے، اور تنبیہ مفصل اور پرزور ہے۔ دعوت یہ ہے کہ پیغمبر کی بات مانو، شرک

سے باز آجاؤ، سب کی بندگی چھوڑ کر اللہ کے بندے بنو اور اپنی دنیوی زندگی کا سارا نظام آخرت کی جوابدہی کے احساس پر قائم کرو۔ فہمائش یہ ہے کہ حیاتِ دنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر کے جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو ٹھکرایا ہے وہ اس سے پہلے نہایت برا انجام دیکھ چکی ہیں، اب کیا ضرور ہے کہ تم بھی اسی راہ چلو جسے تاریخ کے مسلسل تجربات قطعی طور پر تباہی کی راہ ثابت کر چکے ہیں۔ تنبیہ یہ ہے کہ عذاب کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے یہ دراصل ایک مہلت ہے جو اللہ اپنے فضل سے تمہیں عطا کر رہا ہے۔ اس مہلت کے اندر اگر تم نہ سنبھلے تو وہ عذاب آئے گا جو کسی کے ٹالے نہ ٹل سکے گا اور اہل ایمان کی مٹھی بھر جماعت کو چھوڑ کر تمہاری ساری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیگا۔

اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے براہ راست خطاب کی بہ نسبت قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوطؑ، اصحاب مدین، اور قوم فرعون کے قصوں سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ان قصوں میں خاص طور پر جو بات نمایاں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا جب فیصلہ چکانے پر آتا ہے تو پھر بالکل بے لاگ طریقے سے چکاتا ہے۔ اس میں کسی کے ساتھ ذرہ برابر رعایت نہیں ہوتی۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کس کا بیٹا اور کس کا عزیز ہے۔ رحمت صرف اس کے حصہ میں آتی ہے جو راہ راست پر آگیا ہو، ورنہ خدا کے غضب سے نہ کسی پیغمبر کا بیٹا بچتا ہے اور نہ کسی پیغمبر کی بیوی۔ یہی نہیں بلکہ جب ایمان و کفر کا دوٹوک فیصلہ ہو رہا ہو تو دین کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ خود مومن بھی باپ اور بیٹے اور شوہر اور بیوی کے رشتوں کو بھول جائے اور خدا کی شمشیر عدل کی طرح بالکل بے لاگ ہو کر ایک رشتۂ حق کے سوا ہر دوسرے رشتے کو کاٹ پھینکے۔ ایسے موقع پر خون اور نسب کی رشتہ داریوں کا ذرہ برابر بھی لحاظ کر جانا اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کا پورا پورا مظاہرہ تین چار سال بعد مکہ کے مہاجر مسلمانوں نے جنگ بدر میں کر کے دکھا دیا۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

الٓ ر۔ فرمان ہے[1]، جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں[2]، ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے

[1] کتاب کا ترجمہ یہاں انداز بیان کی مناسبت سے "فرمان" کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ کتاب
(باقی حاشیہ صفحہ ۱۵ پر)

کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو[1] اور اس کی طرف پلٹ آؤ[2] تو وہ ایک مقرر مدت تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔[3] لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) اور نوشتے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ حکم اور فرمانِ شاہی کے معنی میں بھی آتا ہے اور خود قرآن میں متعدد مواقع پر یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۲ یعنی اس فرمان میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ پکی اور اٹل ہیں، خوب جچی تلی ہیں، بڑی لفاظی نہیں ہے، خطابت کی ساحری اور تخیل کی شاعری نہیں ہے، بلکہ ٹھیک ٹھیک حقیقت بیان کی گئی ہے اور اس کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو حقیقت سے کم یا زیادہ ہو۔ پھر یہ آیتیں مفصل بھی ہیں، یعنی ان میں ایک ایک بات کھول کھول کر واضح طریقے سے ارشاد ہوئی ہے۔ بیان الجھا ہوا، گنجلک اور مبہم نہیں ہے، بلکہ ہر بات کو الگ الگ، صاف صاف سمجھا کر بتایا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱ یعنی اب تک جو تم اس کی بندگی سے پھرے رہے اور بندوں کی بندگی کرتے رہے اس پر نادم و شرمسار ہو کر اپنے رب سے عفو و درگزر کی درخواست کرو۔ یہی معنی ہیں استغفار کے، اور یہ استغفار بالکل فضول ہے اگر فی الواقع آدمی کو اپنی غلطی کا احساس نہ ہو، اسے چھوڑ دینے کا حقیقی ارادہ نہ ہو اور محض زبان پر استغفر اللہ، استغفر اللہ جاری رہے۔

۲ یعنی جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، اب اپنے اصل مالک کی طرف پلٹو اور بغاوت و نافرمانی چھوڑ کر اطاعت و بندگی کا رویہ اختیار کرو۔ یہی معنی ہیں توبہ کے۔

۳ یعنی دنیا میں تمہارے ٹھیرنے کے لیے جو وقت مقرر ہے، اس وقت تک وہ تم کو بری طرح نہیں بلکہ اچھی طرح رکھے گا۔ اس کی نعمتیں تم پر برسیں گی، اس کی برکتوں سے سرفراز ہو گے، خوش حال و فارغ البال رہو گے، زندگی میں امن و چین نصیب ہوگا، ذلت و خواری کے ساتھ نہیں بلکہ عزت و شرف کے ساتھ جیو گے۔ یہی مضمون دوسرے موقع پر اس طرح ارشاد ہوا ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل - ۱۳) "جو شخص بھی ایمان کے ساتھ نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔" اس سے لوگوں کی اس عام غلط فہمی کو رفع کرنا مقصود ہے جو شیطان نے ہر زمانے میں دنیا پرست آدمی کے کان میں پھونک رکھی ہے کہ خدا ترسی اور راست بازی اور احساسِ ذمہ داری کا طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت بنتی ہو تو بنتی ہو، مگر دنیا تو بگڑ جاتی ہے

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ دیکھو! یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں۔[۵] خبردار! جب یہ کپڑوں سے اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) اور یہاں ایسے لوگوں کے لیے فاقہ مستی و خستہ حالی کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تردید میں فرماتا ہے کہ اس راہ راست کو اختیار کرنے سے تمہاری صرف آخرت ہی نہیں بلکہ دنیا بھی بنے گی۔ آخرت کی طرح اس دنیا کی حقیقی عزت و کامیابی بھی ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے جو سچی خدا پرستی کے ساتھ صالح زندگی بسر کریں، جن کے اخلاق پاکیزہ ہوں، جن کے معاملات درست ہوں، جن پر ہر معاملہ میں بھروسہ کیا جا سکے، جن سے ہر شخص بھلائی کا متوقع ہو اور جن سے کسی انسان کو یا کسی قوم کو شر کا اندیشہ نہ ہو۔

اس کے علاوہ "متاع حسن" کے الفاظ میں ایک اور پہلو بھی ہے جو نگاہ سے اوجھل نہ رہ جانا چاہیے۔ دنیا کا سامان زیست قرآن مجید کی رو سے دو قسم کا ہے۔ ایک وہ سروسامان ہے جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو فتنے میں ڈالنے کے لیے دیا جاتا ہے اور جس سے دھوکا کھا کر ایسے لوگ اپنے آپ کو دنیا پرستی و خدا فراموشی میں اور زیادہ گم کر دیتے ہیں۔ یہ بظاہر تو نعمت ہے مگر بباطن خدا کی پھٹکار اور اس کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ قرآن مجید اس کو "متاع غرور" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ دوسرا وہ سروسامان ہے جس سے انسان خوشحال اور قوی بازو ہو کر اپنے خدا کا اور زیادہ شکرگزار بنتا ہے، خدا اور اس کے بندوں کے اور خود اپنے نفس کے حقوق زیادہ اچھی طرح ادا کرتا ہے، خدا کے دیے ہوئے وسائل سے طاقت پا کر دنیا میں خیر و صلاح کی ترقی اور شر و فساد کے استیصال کے لیے زیادہ کارگر کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہ قرآن کی زبان میں "متاع حسن" ہے یعنی ایسا اچھا سامان زندگی جو محض عیش دنیا ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نتیجہ میں عیش آخرت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

[۴] یعنی جو شخص اخلاق و اعمال میں جتنا بھی آگے بڑھے گا، اللہ اس کو اتنا ہی بڑا درجہ عطا کرے گا۔ اللہ کے ہاں کسی کی خوبی پر پانی نہیں پھیرا جاتا۔ اس کے ہاں جس طرح برائی کی قدر نہیں ہے اسی طرح بھلائی کی ناقدری بھی نہیں ہے۔ اس کی سلطنت کا دستور یہ نہیں ہے کہ

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

وہاں تو جو شخص بھی اپنی سیرت و کردار سے اپنے آپ کو جس فضیلت کا مستحق ثابت کر دے گا وہ فضیلت اس کو ضرور دی جائے گی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا ہوا تو بہت سے لوگ وہاں ایسے تھے (باقی صفحہ ۱۸ پر)

آپ کو ڈھانکتے ہیں اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی، وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں۔ زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے[۱]، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے۔

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا —— جبکہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا[۲] —— تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے[۳]۔ اب اگر تم کہو کہ لوگو مرنے کے بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) جو مخالفت میں تو کچھ بہت زیادہ سرگرم نہ تھے مگر آپ کی دعوت سے سخت بیزار تھے۔ ان لوگوں کا رویہ یہ تھا کہ آپ سے کتراتے تھے، آپ کی کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ کہیں آپ کو بیٹھے دیکھتے تو الٹے پاؤں پھر جاتے دور سے آپ کو آتے دیکھ لیتے تو رخ بدل دیتے یا کپڑے کی اوٹ میں منہ چھپا لیتے تاکہ آمنا سامنا نہ ہو جائے اور آپ انھیں مخاطب کر کے کچھ اپنی باتیں نہ کہنے لگیں۔ اسی قسم کے لوگوں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ یہ لوگ حق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور شتر مرغ کی طرح منہ چھپا کر سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت ہی غائب ہو گئی جس سے انھوں نے منہ چھپایا ہے۔ حالانکہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے اور وہ یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ یہ بے وقوف اس سے بچنے کے لیے منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] یعنی جس خدا کے علم کا حال یہ ہے کہ ایک ایک چڑیا کا گھونسلا اور ایک ایک کیڑے کا بل اس کو معلوم ہے، اور وہ اسی کی جگہ پر اس کو سامان زیست پہنچا رہا ہے، اور جس کو ہر آن اس کی خبر ہے کہ کون جاندار کہاں رہتا ہے اور کہاں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے، اس کے متعلق اگر تم یہ گمان کرتے ہو کہ اس طرح منہ چھپا چھپا کر یا کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر یا آنکھوں پر پردہ ڈال کر تم اس کی پکڑ سے بچ جاؤ گے تو سخت نادان ہو۔ داعی حق سے تم نے منہ چھپا بھی لیا تو آخر اس کا حاصل کیا ہے؟ کیا خدا سے بھی تم چھپ گئے؟ کیا خدا یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ ایک شخص تمھیں امر حق سے آگاہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور تم یہ کوشش کر رہے ہو کہ کسی طرح اس کی کوئی بات تمھارے کان میں نہ پڑنے پائے؟

[۲] یہ جملہ معترضہ ہے جو غالباً لوگوں کے اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اگر پہلے نہ تھے اور بعد میں پیدا کیے گئے تو پہلے کیا تھا۔ اس سوال کو یہاں نقل کیے بغیر اس کا جواب اس مختصر سے فقرے میں دے دیا گیا ہے کہ پہلے پانی تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس پانی سے مراد کیا ہے۔ یہی پانی جسے ہم اس نام سے جانتے ہیں؟ یا یہ لفظ محض استعارے کے طور پر مادے کی اس مائع (Liquid) حالت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو موجودہ صورت میں ڈھالے جانے سے پہلے تھی؟

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو منکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے[۱]۔ اور اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ سنو! جس روز اس سزا کا وقت آگیا تو وہ کسی کے پھیرے نہ پھر سکے گا اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے تھے۔ ع

اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے۔ اور اگر مصیبت کے بعد ہم اسے نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میرے تو سارے دلدر پار ہو گئے، پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے[۲]۔ اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو

(بقیہ حواشی صفحہ ۱۷) رہا یہ ارشاد کہ خدا کا عرش پہلے پانی پر تھا، تو اس کا مفہوم ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ خدا کی سلطنت پانی پر تھی۔

[۵] اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو اس لیے پیدا کیا کہ تم کو (یعنی انسان کو) پیدا کرنا مقصود تھا، اور تمھیں اس لیے پیدا کیا کہ تم پر اخلاقی ذمہ داری کا بار ڈالا جائے، تم کو خلافت کے اختیارات سپرد کیے جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ تم میں سے کون ان اختیارات کو اور اس اخلاقی ذمہ داری کے بوجھ کو کس طرح سنبھالتا ہے۔ اگر اس تخلیق کی تہ میں یہ مقصد نہ ہوتا، اگر اختیارات کی تفویض کے باوجود کسی امتحان کا، کسی محاسبہ اور بازپرس کا اور کسی جزا و سزا کا کوئی سوال نہ ہوتا، اور اگر انسان کو بھی اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونے کے باوجود یونہی بے نتیجہ مر کر مٹی ہو جانا ہی ہوتا، تو پھر یہ سارا کارِ تخلیق بالکل ایک مہمل کھیل تھا اور اس تمام ہنگامۂ وجود کی کوئی حیثیت ایک فعل عبث کے سوا نہ تھی۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] یعنی ان لوگوں کی نادانی کا یہ حال ہے کہ کائنات کو ایک کھلنڈرے کا گھروندا اور اپنے آپ کو اس کے جی بہلانے کا کھلونا سمجھے بیٹھے ہیں اور اس احمقانہ تصور میں ایسے مگن ہیں کہ جب تم انھیں اس کارگاہِ حیات کا سنجیدہ مقصد اور خود ان کے وجود کی معقول غرض و غایت سمجھاتے ہو تو یہ قہقہہ لگاتے ہیں اور تم پر پھبتی کستے ہیں کہ یہ شخص تو جادو کی سی باتیں کرتا ہے۔

[۲] یہ انسان کے چھچھورے پن، سطح بینی، اور قلت تدبر کا حال ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت زندگی میں ہوتا رہتا ہے اور جس کو عام طور پر لوگ اپنے نفس کا حساب لے کر خود اپنے اندر بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ آج خوشحال اور زور آور ہیں تو اکڑ رہے ہیں، فخر کر رہے ہیں، ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آرہا ہے اور خیال تک نہیں آتا کہ کبھی اس بہار پر خزاں بھی آسکتی ہے۔ کل کسی مصیبت کے پھیر میں آگئے تو بلبلا اٹھے، حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے، اور بہت تلملائے تو خدا کو گالیاں دے کر اور اس کی خدائی پر طعن کر کے غم غلط کرنے لگے۔ پھر جب برا وقت گزر گیا اور بھلے دن آئے تو وہی اکڑ

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

صبر کرنے والے[11] اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگذر بھی ہے اور بڑا اجر بھی[12]۔

تو اے پیغمبر! کہیں ایسا نہ ہو کہ تو ان چیزوں میں سے کسی چیز کو چھوڑ دے جو تیری طرف وحی کی جا رہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کہ وہ کہیں گے "اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا" یا یہ کہ "اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا"۔ تُو تو محض خبردار کر دینے والا ہے، آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے[13]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) وہی ڈینگیں اور نعمت کے نشے میں وہی سرمستیاں پھر شروع ہو گئیں۔

انسان کی اس ذلیل صفت کا یہاں کیوں ذکر ہو رہا ہے؟ اس کی غرض ایک نہایت لطیف انداز میں لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ آج اطمینان کے ماحول میں جب ہمارا پیغمبر تمھیں خبردار کرتا ہے کہ خدا کی نافرمانیاں کرتے رہو گے تو تم پر عذاب نازل ہو گا، اور تم اس کی یہ بات سن کر ایک زور کا ٹھٹھا مارتے ہو اور کہتے ہو کہ "دیوانے دیکھتا نہیں کہ ہم پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے ہر طرف ہماری بڑائی کے پھریرے اڑ رہے ہیں، اس وقت تجھے دن دہاڑے یہ ڈراؤنا خواب کیسے نظر آ گیا کہ کوئی عذاب ہم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے"، تو دراصل پیغمبر کی نصیحت کے جواب میں تمھارا یہ ٹھٹھا اسی ذلیل صفت کا ایک ذلیل مظاہرہ ہے۔ خدا تو تمھاری گمراہیوں اور بدکاریوں کے باوجود محض اپنے رحم و کرم سے تمھاری سزا میں تاخیر کر رہا ہے تاکہ تم کسی طرح سنبھل جاؤ، مگر تم اس مہلت کے زمانے میں یہ سوچ رہے ہو کہ ہماری خوشحالی کیسی پائیدار بنیادوں پر قائم ہے اور ہمارا یہ چمن کیسا سدا بہار ہے کہ اس پر خزاں آنے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [11] یہاں صبر کے ایک اور مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ صبر کی صفت اُس چھچھورپن کی ضد ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے صابر وہ شخص ہے جو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھے۔ وقت کی ہر گردش سے اثر لے کر اپنے مزاج کا رنگ نہ بدلتا چلا جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح رویہ پر ہر حال میں قائم رہے۔ اگر کبھی حالات سازگار ہوں اور وہ دولتمندی، اقتدار اور ناموری کے آسمانوں پر چڑھا چلا جا رہا ہو تو بڑائی کے نشے میں مست ہو کر بہکنے نہ لگے، اور اگر کسی دوسرے وقت مصائب و مشکلات کی چکی اسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہر انسانیت کو اس میں ضائع نہ کر دے۔ نعمت کی آزمائش ہو یا مصیبت کی، دونوں صورتوں میں اس کی بردباری اپنے حال پر قائم رہے اور اس کا ظرف کسی چیز کی بھی چھوٹی یا بڑی مقدار سے چھلک نہ پڑے۔

[12] یعنی اللہ ایسے لوگوں کے قصور معاف بھی کرتا ہے اور ان کی بھلائیوں پر اجر بھی دیتا ہے۔

[13] اس ارشاد کا مطلب سمجھنے کے لیے اُن حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں یہ فرمایا گیا ہے۔ مکہ ایک ایسے

(باقی صفحہ ۲ پر)

کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو، "اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمہارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انہیں معبود سمجھنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) قبیلے کا صدر مقام ہے جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار، اپنی دولت و تجارت اور اپنے سیاسی دبدبے کی وجہ سے چھایا ہوا ہے۔ عین اس حالت میں جبکہ یہ لوگ اپنے انتہائی عروج پر ہیں، اس بستی کا ایک آدمی اٹھتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ جس مذہب کے تم پیشوا ہو وہ سراسر گمراہی ہے، جس نظام تمدن کے تم سردار ہو وہ اپنی جڑ تک گلا اور سڑا ہوا نظام ہے، خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تلا کھڑا ہے اور تمہارے لیے اس سے بچنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اس مذہب حق اور اس نظام صالح کو قبول کر لو جو میں خدا کی طرف سے تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس شخص کے ساتھ اس کی پاک سیرت، اور اس کی معقول باتوں کے سوا کوئی ایسی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس سے عام لوگ اسے مامور من اللہ سمجھیں۔ اور گرد و پیش کے حالات میں بھی مذہب و اخلاق اور تمدن کی گہری بنیادی خرابیوں کے سوا کوئی ایسی ظاہری علامت نہیں ہے جو نزول عذاب کی نشاندہی کرتی ہو، بلکہ اس کے برعکس تمام نمایاں علامتیں یہی ظاہر کر رہی ہیں کہ ان لوگوں پر خدا کا (اور ان کے عقیدے کے مطابق دیوتاؤں کا) بڑا فضل ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ بات کہنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے، اور اس کے سوا کچھ ہو بھی نہیں سکتا، کہ چند نہایت صحیح الدماغ اور حقیقت رس لوگوں کے سوا بستی کے سب لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ کوئی ظلم و ستم سے اس کو دبانا چاہتا ہے۔ کوئی جھوٹے الزامات اور اوچھے اعتراضات سے اس کی ہوا اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی متعصبانہ بے رخی سے اس کی ہمت شکنی کرتا ہے۔ اور کوئی مذاق اڑا کر، آوازے اور پھبتیاں کس کر، اور ٹھٹھے لگا کر اس کی باتوں کو ہوا میں اڑا دینا چاہتا ہے۔ یہ استقبال جو کئی سال تک اس شخص کی دعوت کا ہوتا رہتا ہے، جیسا کچھ دل شکن اور مایوس کن ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔ بس یہی صورت حال ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی ہمت بندھانے کے لیے تلقین فرماتا ہے کہ اچھے حالات میں پھول جانا اور برے حالات میں مایوس ہو جانا چھچھورے لوگوں کا کام ہے، ہماری نگاہ میں قیمتی انسان وہ ہے جو نیک ہو اور نیکی کے راستے پر صبر و ثبات اور پامردی کے ساتھ چلنے والا ہو، لہٰذا جس متعصبانہ بے رخی سے، جس تضحیک و استہزاء سے، اور جن جاہلانہ اعتراضات سے تمہارا مقابلہ کیا جا رہا ہے، ان کی وجہ سے تمہارے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ جو صداقت تم پر بذریعہ وحی منکشف کی گئی ہے اسکے اظہار و اعلان میں اور اس کی طرف دعوت دینے میں تمہیں قطعاً کوئی باک نہ ہو۔ تمہارے دل میں اس خیال کا کبھی گزر تک نہ ہو کہ فلاں بات کیسے کہوں جبکہ لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں، اور فلاں حقیقت کا اظہار کیسے کروں جبکہ کوئی اس کے سننے تک کا روادار نہیں ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، تم جسے حق پاتے ہو اسے بے کم و کاست اور بے خوف بیان کیے جاؤ، آگے سب معاملات اللہ کے حوالے ہیں۔

میں) سچے ہو۔ اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا تم (اس امرِ حق کے آگے) سرِ تسلیم خم کرتے ہو؟[لہ]

جو لوگ بس اسی دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں[۲ہ] ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اُس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی، مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے[۳ہ]۔ (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انھوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔

لہ یہاں ایک ہی دلیل سے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت بھی دیا گیا ہے اور توحید کا ثبوت بھی۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) اگر تمہارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیے، لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کہ میں نے اسے خود تصنیف کیا ہے صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ تم ایسی ایک کتاب تصنیف کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر میرے بار بار چیلنج دینے پر بھی تم سب مل کر اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتے تو میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے۔ (۲) پھر جبکہ اس کتاب میں تمہارے معبودوں کی بھی کھلم کھلا مخالفت کی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ ان کی عبادت چھوڑ دو کیونکہ الوہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے، تو ضرور ہے کہ تمہارے معبودوں کو بھی (اگر فی الواقع ان میں کوئی طاقت ہے) میرے دعوے کا جھوٹ ثابت کرنے اور اس کتاب کی نظیر پیش کرنے میں تمہاری مدد کرنی چاہیے۔ لیکن اگر وہ اس فیصلے کی گھڑی میں بھی تمہاری مدد نہیں کرتے اور تمہارے اندر کوئی ایسی طاقت نہیں پھونکتے کہ تم اس کتاب کی نظیر تیار کر سکو، تو اس سے صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ تم نے خواہ مخواہ ان کو معبود بنا رکھا ہے، ورنہ درحقیقت ان کے اندر کوئی قدرت اور کوئی شائبۂ الوہیت نہیں ہے جس کی بنا پر وہ معبود ہونے کے مستحق ہوں۔

۲ہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بات اس مناسبت سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن کی دعوت کو جس قسم کے لوگ اس زمانہ میں رد کر رہے تھے اور آج بھی رد کر رہے ہیں وہ زیادہ تر وہی تھے اور ہیں جن کے دل و دماغ پر دنیا پرستی چھائی ہوئی ہے۔ خدا کے پیغام کو رد کرنے کے لیے جو دلیل بازیاں وہ کرتے ہیں وہ سب تو بعد کی چیزیں ہیں۔ پہلی چیز جو اس انکار کا اصل سبب ہے وہ ان کے نفس کا یہ فیصلہ ہے کہ دنیا اور اس کے مادی فائدوں سے بالاتر کوئی شے قابلِ قدر نہیں ہے، اور یہ کہ ان فائدوں سے متمتع ہونے کے لیے ان کو پوری آزادی حاصل رہنی چاہیے۔

۳ہ یعنی جس کے پیشِ نظر محض دنیا اور اس کا فائدہ ہو، وہ اپنی دنیا بنانے کی جیسی کوشش یہاں کرے گا (باقی صفحہ ۲۲ پر)

پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا[۱]، اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آگیا[۲] اور پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) ویسا ہی اس کا پھل اسے یہاں مل جائے گا لیکن جبکہ آخرت اس کے پیش نظر ہی نہیں ہے اور اس کے لیے اس نے کوئی کوشش نہیں کی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہاں اسے کچھ بھی اس کا فائدہ حاصل ہو۔ وہاں پھل پانے کا امکان تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ دنیا میں آدمی کی سعی ان کاموں کے لیے ہو جو آخرت میں بھی نافع ہوں۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ ایک شاندار مکان اسے رہنے کے لیے ملے اور اس کے لیے وہ تدبیریں اختیار کرتا ہے جن سے یہاں مکان بنا کرتے ہیں تو ضرور ایک عالیشان محل بن کر تیار ہو جائے گا اور اس کی کوئی اینٹ بھی محض اس بنا پر جمنے سے انکار نہ کرے گی کہ ایک کافر اسے جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس شخص کو اپنا یہ محل اور اس کا سارا سروسامان موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی اس دنیا میں چھوڑ دینا پڑے گا اور اس کی کوئی چیز بھی وہ اپنے ساتھ دوسرے عالم میں نہ لے جا سکے گا۔ اگر اس نے آخرت میں محل تعمیر کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے تو کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اس کا یہ محل وہاں اس کے ساتھ منتقل ہو۔ وہاں کوئی محل وہ پا سکتا ہے تو صرف اس صورت میں پا سکتا ہے جبکہ دنیا میں اس کی سعی ان کاموں میں ہو جن سے قانون الٰہی کے مطابق آخرت کا محل بنا کرتا ہے۔

اب سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس دلیل کا تقاضا تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہاں اسے کوئی محل نہ ملے، مگر یہ کیا بات ہے کہ محل کے بجائے وہاں اسے آگ ملے گی؟ اس کا جواب یہ ہے (اور یہ قرآن ہی کا جواب ہے جو مختلف مواقع پر اس نے دیا ہے) کہ جو شخص آخرت کو نظرانداز کر کے محض دنیا کے لیے کام کرتا ہے وہ لازماً و فطرۃً ایسے طریقوں سے کام کرتا ہے جن سے آخرت میں محل کے بجائے آگ کا الاؤ تیار ہوتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی خود اس کو اپنے وجود میں، زمین و آسمان کی ساخت میں، اور کائنات کے نظم و نسق میں اس امر کی کھلی شہادت مل رہی تھی کہ اس دنیا کا خالق، مالک، پروردگار اور حاکم و فرمانروا صرف ایک خدا ہے، اور پھر انہی شہادتوں کو دیکھ کر اس کا دل بھی گواہی دیتا تھا کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ضرور ہونی چاہیے جس میں انسان اپنے خدا کو اپنے اعمال کا حساب دے اور اپنے کیے کی جزا و سزا پائے۔

[۲] یعنی قرآن جس نے آکر اس فطری و عقلی شہادت کی تائید کی اور اسے بتایا کہ فی الواقع حقیقت وہی ہے جس کا نشان آفاق و انفس کے آثار میں تو نے پایا ہے۔

بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے[۱ہ]
اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔ پس اے
پیغمبر! تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا، یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔
اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے[۲ہ]۔ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور
پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو!
خدا کی لعنت ہے ظالموں پر[۳ہ] — اُن ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں، اس کے راستے
کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں[۴ہ] اور آخرت کا انکار کرتے ہیں — وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے[۵ہ]

۱ہ سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو پر اور اس کی خوشنمائیوں پر فریفتہ ہیں ان کے لیے تو قرآن کی دعوت کو رد کر دینا آسان ہے، مگر وہ شخص جو اپنی ہستی میں اور کائنات کے نظام میں توحید و آخرت کی کھلی شہادت پا رہا ہو، اور قرآن نے آکر ٹھیک وہی بات کہی ہو جس کی شہادت وہ پہلے سے اپنے اندر بھی پا رہا تھا اور باہر بھی اور پھر اس کی مزید تائید قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتاب آسمانی سے بھی ہو رہی ہو آخر وہ کس طرح اتنی زبردست شہادتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ان منکرین کا ہم نوا ہو سکتا ہے۔

۲ہ یعنی یہ کہے کہ اللہ کے ساتھ خدائی اور استحقاقِ بندگی میں دوسرے بھی شریک ہیں، یا یہ کہے کہ خدا کو اپنے بندوں کی ہدایت و ضلالت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس نے کوئی کتاب اور کوئی نبی ہماری ہدایت کے لیے نہیں بھیجا ہے بلکہ ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جو ڈھنگ چاہیں اپنی زندگی کے لیے اختیار کرلیں، یا یہ کہے کہ خدا نے ہمیں یونہی کھیل کے طور پر پیدا کیا اور یونہی ہم کو ختم کر دے گا، کوئی جوابدہی ہمیں اس کے سامنے نہیں کرنی ہے اور کوئی جزا و سزا نہیں ہونی ہے۔

۳ہ یہ عالمِ آخرت کا بیان ہے کہ وہاں یہ اعلان ہوگا۔

۴ہ یہ جملہ معترضہ ہے کہ جن ظالموں پر وہاں خدا کی لعنت کا اعلان ہوگا وہ وہی لوگ ہیں جو آج دنیا میں یہ حرکات کر رہے ہیں۔

۵ہ یعنی وہ اس سیدھی راہ کو جو ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ راہ کچھ ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کے جاہلانہ تعصبات اور ان کے اوہام و تخیلات کے مطابق ٹیڑھی ہو جائے تو وہ اسے قبول کریں۔

۶ہ یہ پھر عالمِ آخرت کا بیان ہے۔

اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انھیں اب دوگنا عذاب دیا جائے گا؎، وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انھیں کچھ سوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انھوں نے گھڑ رکھا تھا؎۔ ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب ہی کے ہو کر رہے، تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے؎۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو اندھا بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے اور سننے والا۔ کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؎؟ کیا تم (اس مثال سے)
کوئی سبق نہیں لیتے؟ ع۲

(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا؎ (اس نے کہا) "میں تم لوگوں

؎ ایک عذاب خود گمراہ ہونے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔

؎ یعنی وہ سب نظریات باد ہوا ہو گئے جو انھوں نے خدا اور کائنات اور اپنی ہستی کے متعلق گھڑ رکھے تھے، اور وہ سب بھروسے بھی جھوٹے ثابت ہوئے جو انھوں نے اپنے معبودوں اور سفارشیوں اور سرپرستوں پر کر رکھے تھے، اور وہ قیاسات بھی غلط نکلے جو انھوں نے زندگی بعد موت کے بارے میں قائم کیے تھے۔

؎ یہاں عالم آخرت کا بیان ختم ہوا۔

؎ یعنی کیا ان دونوں کا طرز عمل، اور آخر کار دونوں کا انجام یکساں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص نہ خود راستہ دیکھتا ہے اور نہ کسی ایسے شخص کی بات ہی سنتا ہے جو اسے راستہ بتا رہا ہو وہ ضرور کہیں ٹھوکر کھائے گا اور کہیں کسی سخت حادثے سے دوچار ہو گا۔ بخلاف اس کے جو شخص خود بھی راستہ دیکھ رہا ہو اور کسی واقفِ راہ کی ہدایات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہو وہ ضرور اپنی منزل پر بسلامت پہنچ جائے گا۔ بس یہی فرق ان لوگوں کے درمیان بھی ہے جن میں سے ایک اپنی آنکھوں سے بھی کائنات میں حقیقت کی نشانیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور خدا کے بھیجے ہوئے رہنماؤں کی بات بھی سنتا ہے، اور دوسرا نہ خود ہی آنکھیں کھلی رکھتا ہے کہ خدا کی نشانیاں اسے نظر آئیں اور نہ پیغمبروں کی بات ہی سن کر دیتا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ زندگی میں ان دونوں کا طرز عمل یکساں ہو، اور پھر کیا وجہ ہے کہ آخر کار ان کے انجام میں فرق نہ ہو؟

؎ مناسب ہو گا کہ اس موقع پر سورۂ اعراف رکوع ۸ کے حواشی پیش نظر رکھے جائیں۔

کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا[1]۔" جواب میں اس کی قوم کے سردار، جنھوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے "ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے[2]۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے جو لوگ کمینے اور چھچھورے تھے ان کے سوا کسی نے بھی تمہاری پیروی نہیں کی[3]۔ اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو[4]، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔" اس نے کہا "اے برادرانِ قوم! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا[5] مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو

---

[1] یہ وہی بات ہے جو اس سورہ کے آغاز میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئی ہے۔

[2] وہی جاہلانہ اعتراض جو مکہ کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں پیش کرتے تھے کہ جو شخص ہماری ہی طرح کا ایک معمولی انسان ہے، کھاتا پیتا ہے، چلتا پھرتا ہے، سوتا اور جاگتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، آخر ہم کیسے مان لیں کہ وہ خدا کی طرف سے پیغمبر مقرر ہو کر آیا ہے۔

[3] یہ بھی وہی بات ہے جو مکہ کے بڑے لوگ اور اونچے طبقے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ ان کے ساتھ ہے کون؟ یا تو چند سرپھرے لڑکے ہیں جنھیں دنیا کا کچھ تجربہ نہیں، یا کچھ غلام اور ادنیٰ طبقہ کے عوام ہیں جو عقل سے کورے اور ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔

[4] یعنی یہ جو تم کہتے ہو کہ ہم پر خدا کا فضل ہے اور اس کی رحمت ہے اور وہ لوگ خدا کے غضب میں مبتلا ہیں جنھوں نے ہمارا راستہ اختیار نہیں کیا ہے، تو اس کی کوئی علامت ہمیں نظر نہیں آتی۔ فضل اگر ہے تو ہم پر ہے کہ مال و دولت اور خدم و حشم رکھتے ہیں اور ایک دنیا ہماری سرداری مان رہی ہے۔ تم ٹٹ پونجیے لوگ آخر کس چیز میں ہم سے بڑھے ہوئے ہو کہ تمہیں خدا کا چہیتا سمجھا جائے۔

[5] وہی بات جو ابھی پچھلے رکوع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی جا چکی ہے کہ پہلے میں خود آفاق و انفس میں خدا کی نشانیاں دیکھ کر توحید کی حقیقت تک پہنچ چکا تھا، پھر خدا نے اپنی رحمت (یعنی وحی) سے مجھے نوازا اور ان حقیقتوں کا براہِ راست علم مجھے بخش دیا جن پر میرا دل پہلے سے گواہی دے رہا تھا۔

تمھارے سر چپیک دیں ؟ اور اے میری قوم کے لوگو! میں تم سے کوئی مال نہیں مانگتا،[۱] میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنھوں نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں،[۲] مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا ؟ تمھاری سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں،[۳] اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمھاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں

---

[۱] یعنی میں ایک بے غرض ناصح ہوں۔ اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں بلکہ تمھارے ہی بھلے کے لیے یہ ساری مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کر رہا ہوں۔ تم کسی ایسے ذاتی مفاد کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اس امر حق کی دعوت دینے میں اور اس کے لیے جان توڑ محنتیں کرنے اور مصیبتیں جھیلنے میں میرے پیش نظر ہو۔

[۲] یعنی ان کی قدر و قیمت جو کچھ بھی ہے وہ ان کے رب کو معلوم ہے اور اسی کے حضور جا کر وہ کھلے گی۔ اگر یہ قیمتی جواہر ہیں تو میرے اور تمھارے پھینک دینے سے پتھر نہ ہو جائیں گے، اور اگر یہ بے قیمت پتھر ہیں تو ان کے مالک کو اختیار ہے کہ انھیں جہاں چاہے پھینکے۔ (اس موقع پر سورۂ انعام رکوع ۶ کے حواشی بھی پیش نظر رہیں)

[۳] یہ اُس بات کا جواب ہے جو مخالفین نے کہی تھی کہ ہمیں تو تم بس اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہو۔ اس پر حضرت نوح فرماتے ہیں کہ واقعی میں ایک انسان ہی ہوں، میں نے انسانیت سے بالاتر ہونے کا دعویٰ کیا کب تھا کہ تم مجھ پر یہ اعتراض کرتے ہو۔ میرا دعویٰ جو کچھ ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ خدا نے مجھے علم و عمل کا سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ اس کی آزمائش تم جس طرح چاہو کر لو۔ مگر اس دعوے کی آزمائش کا آخر یہ کونسا طریقہ ہے کہ کبھی تم مجھ سے غیب کی خبریں پوچھتے ہو، اور کبھی ایسے ایسے عجیب مطالبے کرتے ہو کہ گویا خدا کے خزانوں کی ساری کنجیاں میرے پاس ہیں، اور کبھی اس بات پر اعتراض کرتے ہو کہ میں انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہوں گویا میں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ جس آدمی نے عقائد، اخلاق اور تمدن میں صحیح رہبری کا دعویٰ کیا ہے اس سے ان چیزوں کے متعلق جو چاہو پوچھو، مگر تم عجیب لوگ ہو جو اس سے یہ پوچھتے ہو کہ فلاں شخص کی بھینس کٹڑا جنے گی یا پڑیا، گویا انسانی زندگی کے لیے صحیح اصول اخلاق و تمدن بتانے کا کوئی تعلق بھینس کے پیٹ سے بھی ہے!

انھیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔[۱]

آخر کار ان لوگوں نے کہا کہ "اے نوح، تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر سچے ہو۔" نوح نے جواب دیا "وہ تو اللہ ہی لائے گا، اگر چاہے گا، اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو۔ اب اگر میں تمھاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو میری خیر خواہی تمھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جبکہ اللہ ہی نے تمھیں بھٹکا دینے کا ارادہ کر لیا ہو۔[۲] وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تمھیں پلٹنا ہے۔"

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو "اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو مجھ پر اپنے جرم کی ذمہ داری ہے، اور جو جرم تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔"[۳]

---

[۱] یہ جواب اگرچہ حضرت نوح کا تھا، مگر اسی میں ان لوگوں کی باتوں کا جواب بھی ادا ہو گیا جو اسی قسم کے اعتراضات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔

[۲] یعنی اگر اللہ نے تمھاری ہٹ دھرمی، شر پسندی اور خیر سے بے رغبتی دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمھیں راست روی کی توفیق نہ دے اور جن راہوں میں تم خود بھٹکنا چاہتے ہو انھی میں تم کو بھٹکا دے تو اب تمھاری بھلائی کے لیے میری کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔

[۳] انداز کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ فقرہ قصۂ نوح کے اثنا میں جملۂ معترضہ کے طور پر آیا ہے۔ غالباً اس خطبے کو سنتے ہوئے مخالفین نے اعتراض کیا ہوگا کہ محمد یہ قصے بنا بنا کر اس لیے پیش کرتا ہے تاکہ انھیں ہم پر چسپاں کرے۔ جو چوٹیں وہ ہم پر براہ راست نہیں کرنا چاہتا ان کے لیے ایک قصہ گھڑتا ہے اور اس طرح "درحدیث دیگراں" کے انداز میں ہم پر چوٹ کرتا ہے۔ لہٰذا سلسلۂ کلام توڑ کر ان کے اعتراض کا جواب اس فقرے میں دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گھٹیا قسم کے لوگوں کا ذہن ہمیشہ بات کے برے پہلو کی طرف جایا کرتا ہے اور اچھائی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ بات کے اچھے پہلو پر ان کی نظر جا سکے۔ ایک شخص نے اگر کوئی حکمت کی بات کہی ہے یا وہ تمھیں کوئی مفید سبق دے رہا ہے یا تمھاری کسی غلطی پر تم کو متنبہ کر رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی اصلاح کرو

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

نوح پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لاچکے بس وہ لاچکے، اب کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو، اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا، یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں۔ [لہ]
نوح کشتی بنا رہا تھا اور اس کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گذرتا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں، عنقریب تمہیں خود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۷) مگر گھٹیا آدمی ہمیشہ اس میں برائی کا کوئی ایسا پہلو تلاش کرے گا جس سے حکمت اور نصیحت پر پانی پھیر دے اور نہ صرف خود اپنی برائی پر قائم رہے بلکہ قائل کے ذمے بھی الٹی کچھ برائی لگا دے۔ بہتر سے بہتر نصیحت بھی ضائع کی جا سکتی ہے اگر سننے والا اسے خیر خواہی کے بجائے "چوٹ" کے معنی میں لے اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس پر اور اس کے بجائے برا ماننے کی طرف چل پڑے۔ پھر اس قسم کے لوگ ہمیشہ اپنی فکر کی بنا ایک بنیادی بدگمانی پر رکھتے ہیں۔ جس بات کے حقیقت واقعی ہونے اور ایک بناوٹی داستان ہونے کا یکساں امکان ہو مگر وہ ٹھیک ٹھیک تمہارے حال پر چسپاں ہو رہی ہو اور اس میں تمہاری کسی غلطی کی نشاندہی ہوتی ہو۔ تو تم ایک دانشمند آدمی ہو اگر اسے ایک واقعی حقیقت سمجھ کر اس کے سبق آموز پہلو سے فائدہ اٹھاؤ، اور محض ایک بدگمان وکج نظر آدمی ہو اگر کسی ثبوت کے بغیر یہ الزام لگا دو کہ قائل نے محض ہم پر چسپاں کرنے کے لیے یہ قصہ تصنیف کر لیا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا کہ اگر یہ داستان میں نے گھڑی ہے تو اپنے جرم کا میں ذمہ دار ہوں، لیکن جس جرم کا تم ارتکاب کر رہے ہو وہ تو اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی ذمہ داری میں تم ہی پکڑے جاؤ گے نہ کہ میں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [لہ] اس سے معلوم ہوا کہ جب نبی کا پیغام کسی قوم کو پہنچ جاتا ہے تو اسے صرف اس وقت تک مہلت ملتی ہے جب تک اس میں کچھ بھلے آدمیوں کے نکل آنے کا امکان باقی ہو۔ مگر جب اس کے صالح اجزا سب نکل چکتے ہیں اور وہ صرف فاسد عناصر ہی کا مجموعہ رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو پھر کوئی مہلت نہیں دیتا اور اس کی رحمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ سڑے ہوئے پھلوں کے اس ٹوکرے کو دور پھینک دیا جائے تاکہ وہ اچھے پھلوں کو بھی خراب نہ کر دے۔ پھر اس پر رحم کھانا ساری دنیا کے ساتھ اور آنے والی انسانی نسلوں کے ساتھ بے رحمی ہے۔

معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی۔[لہ]
یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور وہ تنور ابل پڑا[ٹہ] تو ہم نے کہا "ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا

لہ یہ ایک عجیب معاملہ ہے جس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے ظاہر سے کس قدر دھوکا کھاتا ہے۔ جب نوح علیہ السلام دریا سے بہت دور خشکی پر اپنا جہاز بنا رہے ہوں گے تو فی الواقع لوگوں کو یہ ایک نہایت مضحکہ خیز فعل محسوس ہوتا ہوگا اور وہ ہنس ہنس کر کہتے ہوں گے کہ بڑے میاں کی دیوانگی آخر کو یہاں تک پہنچی کہ اب آپ خشکی میں جہاز چلائیں گے۔ اس وقت کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی ہوگی کہ چند روز بعد واقعی یہاں جہاز چلے گا۔ وہ اس فعل کو حضرت نوح کی خرابی دماغ کا ایک صریح ثبوت قرار دیتے ہوں گے اور ایک ایک سے کہتے ہوں گے کہ اگر پہلے تمہیں اس شخص کے پاگل پن میں کچھ شبہ تھا تو اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے۔ لیکن جو شخص حقیقت کا علم رکھتا تھا اور جسے معلوم تھا کہ کل یہاں جہاز کی کیا ضرورت پیش آنے والی ہے اسے ان لوگوں کی جہالت و بے خبری پر اور پھر ان کے احمقانہ اطمینان پر الٹی ہنسی آتی ہوگی اور وہ کہتا ہوگا کہ کس قدر نادان ہیں یہ لوگ کہ شامت ان کے سر پر تلی کھڑی ہے، میں انہیں خبردار کر چکا ہوں کہ وہ بس آیا چاہتی ہے اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس سے بچنے کی تیاری بھی کر رہا ہوں، مگر یہ مطمئن بیٹھے ہیں اور الٹا مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہیں۔ اس معاملہ کو اگر پھیلا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے ظاہر و محسوس پہلو کے لحاظ سے عقلمندی و بے وقوفی کا جو معیار قائم کیا جاتا ہے وہ اس معیار سے کس قدر مختلف ہوتا ہے جو علم حقیقت کے لحاظ سے قرار پاتا ہے۔ ظاہر بیں آدمی جس چیز کو انتہائی دانشمندی سمجھتا ہے وہ حقیقت شناس آدمی کی نگاہ میں انتہائی بے وقوفی ہوتی ہے، اور ظاہر بیں کے نزدیک جو چیز بالکل لغو، سراسر دیوانگی اور نرا مضحکہ ہوتی ہے، حقیقت شناس کے لیے وہی کمال دانش، انتہائی سنجیدگی اور عین مقتضائے عقل ہوتی ہے۔

ٹہ اس کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک صحیح وہی ہے جو قرآن کے صریح الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ طوفان کی ابتدا ایک خاص تنور سے ہوئی جس کے نیچے سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا، پھر ایک طرف آسمان سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور دوسری طرف زمین میں جگہ جگہ سے چشمے پھوٹنے لگے۔ یہاں صرف تنور کے ابل پڑنے کا ذکر ہے اور آگے چل کر بارش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مگر سورۂ قمر میں اس کی تفصیل دی گئی ہے کہ
(باقی صفحہ ۳۰ پر)

کشتی میں رکھ لو، اپنے گھر والوں کو بھی ــــ سوائے اُن اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے[۵۱] ــــ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں[۵۲]۔" اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوح نے کہا "سوار ہو جاؤ اس میں، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھیرنا بھی، میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے[۵۳]۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ "ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیے جن سے لگاتار بارش برسنے لگی اور زمین کو پھاڑ دیا کہ ہر طرف چشمے ہی چشمے پھوٹ نکلے اور یہ دونوں طرح کے پانی اُس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گئے جو مقدر کر دیا گیا تھا۔" نیز لفظ تنور پر الف لام داخل کرنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تنور کو اس کام کی ابتدا کے لیے نامزد فرما دیا تھا جو اشارہ پاتے ہی ٹھیک اپنے وقت پر ابل پڑا اور بعد میں طوفان والے تنور کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵۱] یعنی تمہارے گھر کے جن افراد کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں ہیں انھیں کشتی میں نہ بٹھاؤ۔ غالباً یہ دو ہی شخص تھے۔ ایک حضرت نوح کا بیٹا جس کے غرق ہونے کا ابھی ذکر آتا ہے، دوسری حضرت نوح کی بیوی جس کا ذکر سورہ تحریم میں آیا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے افرادِ خاندان بھی ہوں مگر قرآن میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

[۵۲] اس سے ان مورخین اور علماءِ انساب کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے جو تمام انسانی نسلوں کا شجرۂ نسب حضرت نوح کے تین بیٹوں تک پہنچاتے ہیں۔ دراصل اسرائیلی روایات نے یہ غلط فہمی پھیلا دی ہے کہ اس طوفان سے حضرت نوح اور ان کے تین بیٹوں اور ان کی بیویوں کے سوا کوئی نہ بچا تھا۔ لیکن قرآن متعدد مقامات پر اس کی تصریح کرتا ہے کہ حضرت نوح کے خاندان کے سوا اُن کی قوم کی ایک معتد بہ تعداد کو بھی، اگرچہ وہ تھوڑی تھی، اللہ تعالیٰ نے طوفان سے بچا لیا تھا۔ نیز قرآن بعد کی انسانی نسلوں کو صرف حضرت نوح کی اولاد نہیں بلکہ ان سب لوگوں کی اولاد قرار دیتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کشتی میں بٹھایا تھا۔ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اور مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ۔

[۵۳] یہ ہے مومن کی اصلی شان۔ وہ عالم اسباب میں ساری تدابیر قانونِ فطرت کے مطابق اُسی طرح اختیار کرتا ہے جس طرح اہل دنیا کرتے ہیں، اس کا بھروسہ ان تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ پر ہوتا ہے اور وہ خوب سمجھتا ہے کہ اس کی کوئی تدبیر نہ تو ٹھیک شروع ہو سکتی ہے، نہ ٹھیک چل سکتی ہے اور نہ اپنے آخری مطلوب تک پہنچ سکتی ہے جب تک اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم شاملِ حال نہ ہو۔

کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جارہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ نوح کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح نے پکار کر کہا "بیٹا! ہمارے ساتھ سوار ہو جا، کافروں کے ساتھ نہ رہ"۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا "میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا"۔ نوح نے کہا "آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے"۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔

حکم ہوا "اے زمین اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رُک جا"۔ چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا، فیصلہ چکا دیا گیا، کشتی جودی پر ٹک گئی،[1] اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم!



[1] جودی پہاڑ کردستان کے علاقہ میں جزیرہ ابن عمر کے شمالی مشرقی جانب واقع ہے۔ توراۃ میں اس کشتی کے ٹھیرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے جو ارمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک سلسلۂ کوہستان کا نام بھی۔ سلسلۂ کوہستان کے معنی میں جس کو اراراط کہتے ہیں وہ ارمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے اور جبل الجودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے۔ قدیم تاریخوں میں بھی کشتی کے ٹھیرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے جس کی نشاندہی قرآن کر رہا ہے۔ چنانچہ مسیح سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیروسس (Berosus) نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں وہ کشتی نوح کے ٹھیرنے کا مقام جودی ہی بتایا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس (Abydenus) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے، نیز وہ اپنے زمانہ کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنھیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔ (باقی صفحہ ۳۲ پر)

نوح نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا "اے رب! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے[1] اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے"[2]۔ جواب میں ارشاد ہوا "اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے[3]۔ پس تو ایسی چیز کی درخواست مجھ سے نہ کر جسے تو نہیں جانتا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) یہ طوفان جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے عالمگیر طوفان تھا یا اس خاص علاقے میں آیا تھا جہاں حضرت نوح کی قوم آباد تھی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اسرائیلی روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا تھا، مگر قرآن میں یہ بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن کے اشارات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی انسانی نسلیں انہی لوگوں کی اولاد سے ہیں جو طوفان نوح سے بچا لیے گئے تھے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا ہو، کیونکہ یہ بات اس طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک بنی آدم کی آبادی اسی خطہ تک محدود رہی ہو جہاں طوفان آیا تھا، اور طوفان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئی ہوں وہ بتدریج تمام دنیا میں پھیل گئی ہوں۔ اس نظریہ کی تائید دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ دجلہ و فرات کی سرزمین میں ایک زبردست طوفان کا ثبوت تاریخی روایات، آثار قدیمہ اور طبقات الارض سے ملتا ہے، لیکن روئے زمین کے تمام خطوں میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے کسی عالمگیر طوفان کا یقین کیا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ روئے زمین کی اکثر و بیشتر قوموں میں ایک طوفان عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں، حتیٰ کہ آسٹریلیا، امریکہ اور نیو گنی جیسے دور دراز علاقوں کی پرانی روایات میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کسی وقت ان سب قوموں کے آباؤ اجداد ایک ہی خطہ میں آباد ہوں گے جہاں یہ طوفان آیا تھا، اور پھر جب ان کی نسلیں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلیں تو یہ روایات ان کے ساتھ گئیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یعنی تو نے وعدہ کیا تھا کہ میرے گھر والوں کو اس تباہی سے بچائے گا، تو میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں ہی میں سے ہے۔

[2] یعنی تیرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے جس کا کوئی اپیل نہیں، اور تو جو فیصلہ بھی کرتا ہے خالص علم اور کامل انصاف کے ساتھ کرتا ہے۔

[3] یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص جس کے جسم کا کوئی عضو سڑ گیا ہو اور ڈاکٹر نے اس کو کاٹ پھینکنے کا فیصلہ کیا ہو۔ ڈاکٹر سے کہے کہ یہ تو میرے جسم کا ایک حصہ ہے، اسے کیوں کاٹتے ہو، اور ڈاکٹر اس کے جواب میں کہے کہ یہ تمہارے جسم کا حصہ نہیں ہے کیونکہ یہ سڑ چکا ہے۔ اس جواب کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ فی الواقع وہ سڑا ہوا عضو جسم سے کوئی تعلق نہیں

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ ہو جا۔[۵۱] نوح نے فوراً عرض کیا "اے میرے رب میں تیری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲) رکھتا، بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہوگا کہ تمہارے جسم کے لیے جو اعضا مطلوب ہیں وہ تندرست اور کارآمد اعضا ہیں نہ کہ سڑے ہوئے اعضا جو خود بھی کسی کام کے نہ ہوں اور باقی جسم کو بھی خراب کر دینے والے ہوں، لہذا جو عضو بگڑ چکا ہے وہ اب اُس مقصد کے لحاظ سے تمہارے جسم کا ایک حصہ نہیں رہا جس کے لیے اعضا سے جسم کا تعلق مطلوب ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک صالح باپ سے یہ کہنا کہ یہ بیٹا تمہارے گھر والوں میں سے نہیں ہے کیونکہ اخلاق و عمل کے لحاظ سے یہ بگڑ چکا ہے، یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس کے بیٹا ہونے کی نفی کی جا رہی ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ بگڑا ہوا انسان تمہارے صالح خاندان کا فرد نہیں ہے، وہ تمہارے نسبی خاندان کا ایک رکن ہو تو ہوا کرے مگر تمہارے اخلاقی خاندان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں، اور آج جو فیصلہ کیا جا رہا ہے وہ کسی نسلی یا قومی نزاع کا نہیں ہے کہ ایک نسل والے بچائے جائیں اور دوسری نسل والے غارت کر دیے جائیں، بلکہ یہ کفر و ایمان کی نزاع کا فیصلہ ہے جس میں صرف صالح بچائے جائیں گے اور فاسد مٹا دیے جائیں گے۔

بیٹے کو بگڑا ہوا کام کہہ کر ایک اور اہم حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ ظاہر بیں آدمی اولاد کو صرف اس لیے پرورش کرتا ہے اور اسے محبوب رکھتا ہے کہ وہ اس کی صلب سے یا اس کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ صالح ہو یا غیر صالح لیکن مومن کی نگاہ تو حقیقت پر ہونی چاہیے۔ اُسے تو اولاد کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ چند انسان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے فطری طریقے سے میرے سپرد کیا ہے تاکہ ان کو پال پوس کر اور تربیت دے کر اُس مقصد کے لیے تیار کروں جس کے لیے اللہ نے دنیا میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ اب اگر اس کی تمام کوششوں اور محنتوں کے باوجود کوئی شخص جو اس کے گھر پیدا ہوا تھا، اس مقصد کے لیے تیار نہ ہو سکا اور اپنے اس رب ہی کا وفادار و خادم نہ بنا جس نے اس کو مومن کے حوالے کیا تھا، تو مومن کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی ساری محنت و کوشش ضائع ہو گئی، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایسی اولاد کے ساتھ اسے کوئی دلبستگی ہو۔

پھر جب یہ معاملہ اولاد جیسی عزیز ترین چیز کے ساتھ ہے تو دوسرے رشتہ داروں کے متعلق مومن کا نقطہ نظر جو کچھ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ ایمان ایک فکری و اخلاقی صفت ہے۔ مومن اسی صفت کے لحاظ سے مومن کہلاتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ مومن ہونے کی حیثیت سے اس کا کوئی رشتہ بجز اخلاق و ایمانی رشتے کے نہیں ہے۔ گوشت پوست کے رشتہ دار اگر اس صفت میں اس کے ساتھ شریک ہیں تو یقیناً وہ اس کے رشتہ دار ہیں، لیکن اگر وہ اس صفت سے خالی ہیں تو مومن محض گوشت پوست کا تعلق رکھے گا، اس کا قلبی و روحی تعلق ان سے نہیں ہو سکتا اور اگر ایمان و کفر کی نزاع میں وہ مومن کے مدمقابل ہیں تو اس کے لیے وہ بالکل اجنبی کا درجہ رکھتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا ۳۴ پر)

پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔"[۱]

حکم ہوا "اے نوح اتر جا[۲]، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے

(حاشیہ صفحہ ۴۳) ۱ اس ارشاد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ حضرت نوح کے اندر روحِ ایمان کی کمی تھی، یا ان کے ایمان میں جاہلیت کا کوئی شائبہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ہر وقت اس بلند ترین معیارِ کمال پر قائم رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ لیکن جونہی کہ اسے یہ احساس ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احساس کرا دیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیارِ مطلوب سے نیچے جا رہا ہے، وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہیں ہوتا۔ حضرت نوح کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جان جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس نظارہ سے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لیے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے، تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہو کر اُس طرزِ فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱ پسرِ نوح کا یہ قصہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے نہایت مؤثر پیرایہ میں یہ بتایا ہے کہ اس کا انصاف کس قدر بے لاگ اور اس کا فیصلہ کیسا دو ٹوک ہوتا ہے۔ مشرکینِ مکہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کیسے ہی کام کریں، مگر ہم پر خدا کا غضب نازل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم حضرت ابراہیم کی اولاد اور فلاں فلاں دیویوں اور دیوتاؤں کے متوسل ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بھی ایسے ہی کچھ گمان تھے اور ہیں۔ اور بہت سے غلط کار مسلمان بھی اس قسم کے جھوٹے بھروسوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں کہ ہم فلاں حضرت کی اولاد اور فلاں حضرت کے دامن گرفتہ ہیں، ان کی سفارش ہم کو خدا کے انصاف سے بچا لے گی۔ لیکن یہاں یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لختِ جگر کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہے اور تڑپ کر بیٹے کی معافی کے لیے درخواست کرتا ہے، لیکن دربارِ خداوندی سے الٹی اس پر ڈانٹ پڑ جاتی ہے اور باپ کی پیغمبری بھی ایک بدعمل بیٹے کو عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

۲ یعنی اُس پہاڑ سے جس پر کشتی ٹھیری تھی۔

ساتھ ہیں، اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جن کو ہم کچھ مدت سامانِ زندگی بخشیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔"

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں۔[۱] اس سے پہلے نہ تو ان کو جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔ پس صبر کر، انجام کار متقیوں ہی کے حق میں ہے۔[۲] ۴۹

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔[۳] اس نے کہا "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، تمہارے لیے کوئی حقیقی معبود اس کے سوا نہیں ہے۔[۴] تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔[۵] اے برادرانِ قوم! اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟[۶] اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے

---

۱ خطاب ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

۲ یعنی جس طرح نوح اور ان کے ساتھیوں ہی کا آخرکار بول بالا ہوا، اسی طرح تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا بھی ہوگا، اور خدا کا قانون یہی ہے کہ ابتدائے کار میں دشمنانِ حق خواہ کتنے ہی کامیاب ہوں مگر آخری کامیابی صرف ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہے جو خدا سے ڈر کر فکر و عمل کی غلط راہوں سے بچتے ہوئے مقصدِ حق کے لیے کام کرتے ہیں۔ لہٰذا اس وقت جو مصائب و شدائد تم پر گزر رہے ہیں، جن مشکلات سے تم دوچار ہو رہے ہو، اور تمہاری دعوت کو دبانے میں تمہارے مخالفوں کو بظاہر جو کامیابی ہوتی نظر آ رہی ہے، اس پر بددل نہ ہو بلکہ ہمت اور صبر کے ساتھ اپنا کام کیے چلے جاؤ۔

۳ سورۂ اعراف رکوع ۹ کے حواشی پیشِ نظر رہیں۔

۴ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے الٰہ کا لفظ قرآن مجید میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک وہ معبود جس کے متعلق لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہو کہ وہ خدائی کی صفات اور طاقتیں رکھتا ہے اور اس بنا پر وہ فی الواقع اس کی بندگی و پرستش کرتے ہوں۔ دوسرا وہ معبود جو درحقیقت خدائی صفات و اقتدارات کا مالک ہے اور اس بنا پر اس کا مستحق ہے کہ اس کی بندگی و پرستش کی جائے۔ یہاں لفظ الٰہ دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۵ یعنی وہ تمام دوسرے الٰہ جن کی تم بندگی و پرستش کر رہے ہو، حقیقت میں کسی قسم کی بھی خدائی صفات اور طاقتیں نہیں رکھتے۔ بندگی و پرستش کا کوئی استحقاق ان کو حاصل نہیں ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ان کو معبود بنا رکھا ہے۔

۶ یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے جس میں ایک بڑا استدلال سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (باقی صفحہ ۳۶ پر)

دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔[۵] مجرموں کی طرح منہ نہ پھیرو۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵) ایسی بات کو جس طرح سرسری طور پر تم نظر انداز کر رہے ہو اور اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ ورنہ اگر تم عقل سے کام لینے والے ہوتے تو ضرور سوچتے کہ جو شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے بغیر دعوت و تبلیغ اور تذکیر و نصیحت کی یہ سب مشقتیں جھیل رہا ہے، جس کی اس تگ و دو میں تم کسی شخصی یا خاندانی مفاد کا شائبہ تک نہیں پا سکتے، وہ ضرور اپنے پاس یقین و اذعان کی کوئی ایسی بنیاد اور ضمیر کے اطمینان کی کوئی ایسی وجہ رکھتا ہے جس کی بنا پر اس نے اپنا عیش و آرام چھوڑ کر، اپنی دنیا بنانے کی فکر سے بے پروا ہو کر، اپنے آپ کو اس جوکھم میں ڈالا ہے کہ صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے عقائد، رسوم اور طرز زندگی کے خلاف آواز اٹھائے اور اس کی بدولت دنیا بھر کی دشمنی مول لے لے۔ ایسے شخص کی بات کم از کم اتنی بے وزن تو نہیں ہو سکتی کہ بغیر سوچے سمجھے اسے یونہی ٹال دیا جائے اور اس پر سنجیدہ غور و فکر کی ذرا سی تکلیف بھی ذہن کو نہ دی جائے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] یہ وہی بات ہے جو پہلے رکوع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہوائی گئی ہے کہ اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ تم کو اچھا سامان زندگی دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت ہی میں نہیں اس دنیا میں بھی قوموں کی قسمتوں کا اتار چڑھاؤ اخلاقی بنیادوں ہی پر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس عالم پر جو فرمانروائی کر رہا ہے وہ اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے نہ کہ ان طبعی اصولوں پر جو اخلاقی خیر و شر کے امتیاز سے خالی ہوں۔ یہ بات کئی مقامات پر قرآن میں فرمائی گئی ہے کہ جب ایک قوم کے پاس نبی کے ذریعہ سے خدا کا پیغام پہنچتا ہے تو اس کی قسمت اس پیغام کے ساتھ معلق ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اسے قبول کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اگر رد کر دیتی ہے تو اسے تباہ کر ڈالا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک دفعہ ہے اُس اخلاقی قانون کی جس پر اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے۔ اسی طرح اس قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ جو قوم دنیا کی خوشحالی سے فریب کھا کر ظلم و معصیت کی راہوں پر چل نکلتی ہے اس کا انجام بربادی ہے، لیکن عین اس وقت جبکہ وہ اپنے اس برے انجام کی طرف بگ ٹٹ چلی جا رہی ہو، اگر وہ اپنی غلطی کو محسوس کر لے اور نافرمانی چھوڑ کر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے تو اس کی قسمت بدل جاتی ہے، اس کی مہلت عمل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور مستقبل میں اس کے لیے عذاب کے بجائے انعام، ترقی اور سرفرازی کا فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے۔

انھوں نے جواب دیا "اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے[1]، اور تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے، اور تجھ پر ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے[2]۔"

ہود نے کہا "میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں[3]، اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھیرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں[4]۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو، میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو[5]۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے[6]۔ اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو،

[1] یعنی ایسی کوئی کھلی علامت یا ایسی کوئی واضح دلیل جس سے ہم غیر مشتبہ طور پر معلوم کر لیں کہ اللہ نے تجھے بھیجا ہے اور جو بات تو پیش کر رہا ہے وہ حق ہے۔

[2] یعنی تو نے کسی دیوی یا دیوتا یا کسی حضرت کے آستانے پر کچھ گستاخی کی ہوگی، اسی کا خمیازہ ہے جو تو بھگت رہا ہے کہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے اور وہی بستیاں جن میں کل تو عزت کے ساتھ رہتا تھا آج وہاں گالیوں اور پتھروں سے تیری تواضع ہو رہی ہے۔

[3] یعنی تم کہتے ہو کہ میں کوئی شہادت لے کر نہیں آیا، حالانکہ چھوٹی چھوٹی شہادتیں پیش کرنے کے بجائے میں تو سب سے بڑی شہادت اس خدا کی پیش کر رہا ہوں جو اپنی ساری خدائی کے ساتھ کائنات ہستی کے ہر گوشے اور ہر جلوے میں اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ جو حقیقتیں میں نے تم سے بیان کی ہیں وہ سراسر حق ہیں، ان میں جھوٹ کا کوئی شائبہ تک نہیں، اور جو تصورات تم نے قائم کر رکھے ہیں وہ بالکل افترا ہیں، سچائی ان میں ذرہ برابر بھی نہیں۔

[4] یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ اگر تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ فرمایا: میں بھی یہ فیصلہ سن رکھو کہ تمھارے ان معبودوں سے میں قطعی بیزار ہوں۔

[5] یہ ان کے اس فقرے کا جواب ہے کہ ہمارے معبودوں کی تجھ پر مار پڑی ہے۔

[6] یعنی وہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ اس کا ہر کام سیدھا ہے۔ اس کے ہاں اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ وہ سراسر حق اور عدل کے ساتھ خدائی کر رہا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم گمراہ و بدکار ہو اور پھر فلاح پاؤ، اور میں راستباز و نیکوکار رہوں اور پھر ٹوٹے میں رہوں۔

جو پیغام دے کر میں بھیجا گیا تھا وہ میں پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے[۱]۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے"۔

پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے نجات دیدی اور ایک سخت عذاب سے انھیں بچالیا۔

یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انھوں نے انکار کیا۔ اس کے رسولوں کی بات نہ مانی[۲]، اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی۔ سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیے گئے عاد، ہود کی قوم کے لوگ۔

---

[۱] یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

[۲] اگرچہ ان کے پاس ایک ہی رسول آیا تھا، مگر جس چیز کی طرف اس نے دعوت دی تھی وہ وہی ایک دعوت تھی جو ہمیشہ ہر زمانے اور ہر قوم میں خدا کے رسول پیش کرتے رہے ہیں، اسی لیے ایک رسول کی بات نہ ماننے کو سارے رسولوں کی نافرمانی قرار دیا گیا۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۲) کبھی تو ان حضرات کی مرعوبیت اور بے بسی پر افسوس ہوتا ہے اور کبھی ان کی غلط روی پر۔ حالانکہ اگر وہ پروپگنڈے سے مرعوب نہ ہوتے اور خواہ مخواہ کو پرائے جھگڑے اپنے سر نہ لیتے بلکہ اپنی حمایت نشر اسلام ہی تک محدود رکھتے تو ان بہت سی بوالفضولیوں سے بالکل محفوظ رہ جاتے جن میں ان کو چارو ناچار مبتلا ہونا پڑا اور جن کی وجہ سے وہ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اس کی دعوت کی راہ میں بہت سے کانٹے بو گئے جو ایک ایک کر کے آج ان لوگوں کو چننے پڑیں گے جو اس راہ میں قدم رکھنا چاہیں گے۔

مقالات

مقتضیاتِ ایمان

(د)

از جناب مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری

۴- ایمان بالکتاب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے نہ صرف انبیاء و رسل کو بھیجا بلکہ ان پر اپنی کتابیں بھی اتاریں، جو حکومت الٰہیہ کا آئین و دستور، اور ہدایت نامہ ہیں۔ درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کو پہنچانے، پڑھ کر سنانے، کھول کھول کر سمجھانے، اور جس کے منشا کے مطابق زندگی کا پورا نظام عملاً قائم کر کے دکھا دینے کے لیے نبی کی بعثت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی تشکیل اور انسان کی تمام مادی و روحانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اصول و قواعد اور کلیات و احکام کے ایسے مجموعے دیے ہیں جو فطرت کے عین مطابق اخلاق و روحانیت، فکر و نظر، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت، سیاست اور نظم ملکی، غرض انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشے کو درست کرتے ہیں۔ ان ناموں کا ہر لفظ و معنی خالص و بے آمیز وحیِ الٰہی ہوتا ہے۔ کتاب کے اندر رسول کی اپنی فہم و فراست، فکر و نظر اور قصد و ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ کتاب ایک امانت خداوندی ہوتی ہے جو اس کے بندوں تک بے کم و کاست، بلا کسی ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر و تبدل کے پوری حفاظت اور ذمہ داری کے ساتھ پہنچا دی جاتی ہے۔ پھر اس کو لانے والے رسول کی شخصیت اپنی سیرت و کردار میں اس کتاب کے مقصد و مدعا کا مجسم نمونہ ہوتی ہے اور رسول اس کو انسانوں میں اپنی دعوت و تبلیغ سے اور عملی جد و جہد سے حکمت کے ساتھ بتدریج جاری و نافذ کرتا ہے۔

ان کتابوں کے نازل کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان کے افکار، اخلاق اور اعمال کے لیے ایک معیار مقرر کر دیا جائے جس کے مطابق پوری انسانی زندگی اپنے تمام پہلوؤں سمیت

ڈھل جائے۔ ہر وہ معیار توڑ دیا جائے جو اس کے خلاف ہو۔ ہر وہ قانون زندگی مٹا دیا جائے جو اس کی ضد ہو۔ مخلوق صرف اپنے خالق کے فرمان کی مطیع ہو۔ اور تابع فرمان افراد کی ترکیب سے ایک ایسی مسلم سوسائٹی وجود میں آئے جس کے افکار و اعمال اور رجحانات و میلانات کا پورا دارومدار، خدا پرستانہ نظریہ پر ہو نہ کہ باغیانہ خودمختاری پر۔ جس کے عمل کی بنیاد ایک مستقل قانون اخلاق پر ہو نہ کہ تجربہ و مصلحت کی نری ابن الوقتی پر کرپتے کی طرح جدھر جدھر ہوائیں اسے اڑائیں وہ اڑتی پھرے۔

قرآن عزیز نے اُن تمام الٰہی کتابوں اور آسمانی صحیفوں کو ماننے کی تلقین کی ہے جو تمام رسولوں پر اللہ تعالیٰ نے اتاری ہیں خواہ وہ کسی زمانے، کسی قوم اور کسی زبان میں آئی ہوں۔ بعض کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے اور بعض کا ذکر مجمل ہے۔ توریت، انجیل، زبور اور صحف ابراہیم کا صاف صاف تذکرہ موجود ہے اس لیے ان پر ان تمام کیفیتوں اور خصوصیتوں کے ساتھ ایمان لانا ہوگا جو قرآن عزیز میں بیان کی گئی ہیں۔ جہاں اجمال ہے وہاں ایمان بھی مجمل رہے گا اور جہاں تفصیل ہے وہاں ایمان میں اتنی ہی تفصیل ہوگی جتنی قرآن میں پائی جاتی ہے۔ تاریخی استناد یا دوسرے ذرائع سے اس میں زیادتی اور اضافہ کرکے خواہ مخواہ کی بحثوں کا دروازہ نہ کھولنا چاہیے جیسا کہ عام اہل مناظرہ کا شیوہ ہے۔

جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء پر آئی ہیں ان سب کا منبع اور ماخذ ایک ہی ہے۔ سب میں ایک ہی نور حقیقت کی روشنی جلوہ افگن ہے۔ اس لیے کسی ایک کو جھٹلانا اور کسی ایک کو مان لینا جائز نہیں ہو سکتا۔ مانیں تو سب کو مانیں اور انکار کریں تو سب کا انکار ہو۔ لیکن اس ماننے کے معنی صرف یہ ہیں کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا تھا وہ برحق تھا، نہ یہ کہ جو کچھ اب ان کتابوں میں اہل کتاب کی تحریفات کے بعد پایا جاتا ہے وہ سب بھی برحق ہے۔ دنیا میں آج تحریف سے محفوظ صرف ایک کتاب پائی جاتی ہے اور وہ قرآن ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں تمام کتب سابقہ پر تنقید کی جائے اور ان کا صرف اتنا حصہ صحیح و سالم مانا جائے جو قرآنی تعلیمات کے مخالف نہ ہو۔ قرآن حکیم تمام الٰہی کتابوں کا محض مصدق (تصدیق کرنے والا) ہی نہیں ہے بلکہ ان پر "مہیمن" بھی ہے۔ یعنی محافظ و نگراں۔ پس جو تحریفات اہل کتاب نے کلام الٰہی میں کی ہیں وہ قرآن کے معیار پر جانچ کر چھانٹ دی جاسکتی

ہیں اور ہر کتاب میں سے وہ حصے الگ نکال لیے جا سکتے ہیں جو کلام الٰہی میں سے اب تک ان کے اندر باقی ہیں۔

قرآن کے ہوتے ہوئے تمام پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ انسان کو اس حقیقت کا پورا ادراک ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا ہے جس میں اس نے اپنے فضل و کرم سے نوع انسانی کے لیے تذکیر و یاد دہانی، موعظت و اعتبار، اور اصلاح کا سامان نہ اتارا ہو اور انسانی زندگی کے لیے مفصل قوانین نہ دیے ہوں۔ اُس کی طرف سے ہر زمانہ میں تشریعی رہنمائی کا اُسی طرح بندوبست اور کامل و مکمل انتظام فرمایا گیا ہے جس طرح تکوینی اسباب کے تحت طبعی ساز و سامان حیات کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے۔ اب اگر اس میں تحریف ہوئی تو اسی طرح ہوئی جس طرح انسان اپنی خواہشات نفس کے اتباع میں خدا کے پیدا کئے ہوئے پاک رزق کے اندر تحریف کرتا رہا ہے۔ جس طرح انسان نے غلے اور پھل جیسے عمدہ سامان غذا کو سڑا کر شراب جیسی عقل کو خراب کرنے والی چیز بنائی، اور جس طرح انسان ہوا جیسی صاف چیز کو تمباکو کے دھوئیں سے آلودہ کر کے اپنے پھیپھڑوں میں پہنچانا پسند کرتا ہے، اسی طرح انسان خدا کی بھیجی ہوئی صاف ستھری ہدایت میں بھی اپنی خواہشات نفس کی، اپنے تعصبات کی، اور اپنے تخیلات کی آمیزش بھی کرتا رہا ہے۔ پھر جس طرح ایک صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت آدمی کا کام یہ ہے کہ جب خالص غذا مل رہی ہو تو آمیزش کی ہوئی غذا نہ کھائے اور جب صاف ہوا مل رہی ہو تو دھوئیں کی ماری ہوئی ہوا میں سانس نہ لے۔ اسی طرح اس کا کام یہ بھی ہے کہ جب قرآن کی صورت میں اسے خدا کی خالص ہدایت مل رہی ہو تو خواہ مخواہ اپنے آبائی تعصبات کی بنا پر ان کتابوں کے ساتھ نہ چمٹا رہے جن میں ہدایت الٰہی انسانی آمیزشوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتابوں میں ان کے ماننے والوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں ملا کر اللہ کے کلام کو اس قدر بدل دیا ہے کہ آج ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہ سکی ہے۔ انھوں نے الفاظ میں بھی آمیزش کی ہے اور معنوں کو بھی بدلا اور بگاڑا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ترجمہ در ترجمہ سے یہ کتابیں اور زیادہ مسخ ہو گئی ہیں اور

اب ان میں خدا کی خالص ہدایت کا پالینا ممکن نہیں رہا ہے۔ پھر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب قرآن کی تصدیق کردہ کتب سماوی میں تغیر و تبدل اور تحریفات کا یہ حال ہے تو ان کتابوں کا حال کیا ہوگا جو محض ان کے ماننے والوں کی مزعومہ عقیدت مندی کے باعث "کتب الٰہی" کہلاتی ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض میں الٰہی روشنی کے کچھ آثار ضرور محسوس ہوتے ہیں، مگر ان کے ساتھ ہی ساتھ خرافات و اوہام، غیر عقلی و غیر فطری امور، اخلاق سے گری ہوئی باتیں، اور نسلی و قومی اور طبقاتی تعصبات بھی ان کے اندر موجود ہیں اور ایک معقول آدمی کے لیے یہ سخت مشکل ہے کہ ان کو خدا کی کتابیں بھی مانے اور ان کی لغویات کا انکار بھی کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتابیں انسانی زندگی کے لیے کوئی صالح نظام تمدن تو کیا سرے سے موجودہ زمانے کی متمدن زندگی کے لیے کوئی بنیاد ہی فراہم نہیں کرتیں اور یہی باعث ہے کہ آج ان کے پیرووں کی حالت زار یہ ہے کہ وہ اپنی "مذہبی کتابوں" کو مانتے ہوئے اور اپنے مذہبی پوجا پاٹ کے مراسم کی پابندی کرتے ہوئے بھی ہر مادی فلسفے اور ہر غیر مذہبی و غیر روحانی نظام زندگی کی تحریکات کا ساتھ دیے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ دور کے انسانی مسائل کا کوئی حل ان کو اپنی اُن کتابوں میں نہیں ملتا جن کے متعلق وہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا کی کتابیں ہیں۔

پس قرآن جب پچھلی کتابوں پر ایمان لانے کے لیے کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان کتابوں کو جیسی کہ وہ اب پائی جاتی ہیں جوں کا توں مان لیا جائے۔ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان قرآن پر ایمان لاتے وقت اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ وہ اُس ہدایت کو مان رہا ہے جو پہلی مرتبہ ساتویں صدی عیسوی میں آئی ہے، بلکہ یہ سمجھتے ہوئے مانے کہ یہ وہی ازلی و ابدی ہدایت ہے جو ہر زمانے میں خدا نے انسانوں کو دی ہے۔ یہی معنی ہیں اس ارشاد کے کہ:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ	اور (قرآن سے ہدایت پانیوالے متقی وہ ہیں) جو ایمان لاتے
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرہ)	ہیں اُس پر جو تمھاری طرف (اے محمد) اتارا گیا ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اتارا گیا تھا۔

یعنی ایمان کے لوازم میں سے یہ ہے کہ صداقت کو مانے خواہ دنیا میں جس نے بھی پیش کی ہو، اور یہ

نہ کہے کہ میں صرف اپنے گھر کی صداقت کو مانوں گا اور ہر اس چیز سے انکار کر دوں گا جو میرے گھر کی نہ ہو خواہ وہ بھی صداقت ہی ہو، جیسا کہ یہودیوں کا حال تھا کہ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاءَهٗ (بقرہ) ایک صداقت پسند آدمی تو ہر اس سچائی کو مانے گا جو فی الواقع اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہو۔ سچائی کو ماننے میں کوئی نسلی غرور، کوئی قومی تکبر اور کوئی رنگ و وطن سدِ راہ نہ ہونا چاہیے۔ یہ اعلیٰ درجہ کی بلند خیالی اور اولوالعزمی ہے کہ ایک مسلم حق کو بحیثیت حق کے مان لیتا ہے خواہ وہ دنیا میں کہیں پایا جائے اور باطل سے منہ موڑ لیتا ہے خواہ وہ اس کے اپنے گھر میں ہو۔

پھر قرآن جو کچھ خود اپنے متعلق کہتا ہے وہ یہ ہے کہ میں خدا کی خالص اور بے میل ہدایت ہوں جس میں دوسری کتب آسمانی کی طرح کوئی تحریف اور آمیزش نہ ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ لہٰذا ایمان بالکتاب کا یہ تقاضا کہ کتب آسمانی کی پیروی کی جائے صرف اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ قرآن کی پیروی کی جائے۔ دوسری کتابوں پر ایمان اجمالی تصدیق کی حد تک ہے، اور قرآن پر ایمان کامل تصدیق، کامل اتباع اور قطعی اطاعت کے لیے ہے۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنی دراصل یہ ماننا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ سراسر حق اور عین علم ہے۔ اس کے عقائد اور تصورات، اس کے اصول اور کلیات، اس کی اخلاقی ہدایات، اس کے اوامر و نواہی، اس کے قوانین اور ضوابط سب کو جوں کا توں اور بے چون و چرا مان لیا جائے اور ان کے متعلق یہ اذعان و ایقان ہو جائے کہ ہماری زندگی کے لیے صحیح راستہ صرف وہ ہے جو اس کتاب میں بتایا گیا ہے، اور ہر وہ چیز غلط ہے جو اس کے خلاف ہے۔ جب تک یہ ذہنی مرحلہ پورا نہ ہو جائے کوئی خارجی مرحلہ آ ہی نہیں سکتا اور نہ عملی زندگی کے مطالبات ہی سامنے لائے جا سکتے ہیں۔ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان مطلوب کی تعبیر اس طرح فرمائی ہے کہ یہ ایمان "ماجئت بہ" پر ہونا چاہیے یعنی میں جو نظام زندگی اللہ کی طرف سے انسانی دنیا کے لیے لایا ہوں، جب تک کوئی اس کل کے کل کو نہ مانے اور بحیثیت مجموعی اس پر ایمان نہ لائے وہ مومن ہی نہیں ہو سکتا۔

اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر کچھ لوگ ایسے ہوں جو قرآنی نظام زندگی کے کسی حصے کو تو قابل

عمل قرار دیں اور کسی حصہ کے متعلق یہ خیال کریں کہ وہ اس دور میں قابلِ عمل نہیں ہے، یا یہ نظریہ رکھیں کہ اس دوسرے حصہ کو محض برحق مان لینا کافی ہے اور برحق مان لینے کے بعد یہ بالکل حق ہے کہ ہم دنیا کے جس چلتے ہوئے نظام کی چاہیں پیروی کریں، یا یہ سمجھیں کہ چوری پر ہاتھ کاٹ ڈالنا، زنا پر کوڑے لگانا یا سنگسار کر دینا، سود کا حرام ہونا اور اسی قسم کے دوسرے قوانین اس "روشن زمانے" کے لیے موزون و مناسب ہی نہیں ہیں بلکہ یہ تو عرب کے ماحول کی وحشت کے لیے مناسب تھے، تو ایسے لوگوں کے "ایمان" کا کیا اعتبار ہوگا۔ پھر اُن قومی تحریکوں، اداروں اور انجمنوں کا کیا حکم ہوگا جو اسی قسم کے افکار و خیالات رکھنے والے لوگوں کی فکری و عملی رہنمائی میں چل رہی ہوں اور جن میں شامل ہونے کے لیے سرے سے ایمان کی ضرورت ہی نہ ہو بلکہ "قومی فوج" میں بھرتی ہونے کے لیے محض ایک فارم کی خانہ پری کافی ہو۔ اُس گروہ پر تو چنداں تعجب نہیں ہے جس نے مغربی طرز کی تعلیم و تربیت پائی ہے اور جو محض قوم پرستانہ جوش و خروش میں اتنا ہی سوچ سکتا اور کر سکتا ہے جتنا کر رہا ہے، لیکن حیرت ہے اُن مقدس اور مزکی ہستیوں پر جو "ایمانیات" اور اس کے تمام اساسی معتقدات کو خوب اچھی طرح جاننے کے باوجود اُن امور میں وقت، قوت اور اپنی نیک سیرت کو ضائع کر رہے ہیں جو "ایمان بالقرآن" کے بالکل منافی اور ضد ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن پر ایمان لانے کا حقیقی مقتضٰی یہ ہے کہ ہم اس نظامِ زندگی کو عملاً قائم کرنے کی جد و جہد کریں جو قرآن پیش کر رہا ہے اور اپنی زندگی پر سے، نیز اپنے گرد و پیش کی زندگی پر سے ان نظاموں کے تسلط کو مٹانے کی سعی کریں جن کو قرآن باطل کہتا ہے۔ اس سعی و جہد سے اس لیے منہ موڑنا کہ اس میں دنیوی نقطۂ نظر سے کامیابی کی امید نہیں ہے، فی الواقع ایک غیر ایمانی حرکت ہے، اور اس سے بڑھ کر غیر ایمانی حرکت یہ ہے کہ قرآن کے منشا کے خلاف جو نظام ہیں انھیں قائم کرنے کے لیے تگ و دو کی جائے محض اس لیے کہ ان میں کامیابی کی توقع ہے۔ کیا ہم قرآن پر ایمان دنیوی کامیابی کی شرط کے ساتھ لائے ہیں؟ ہم کو حق پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا تھا یا اُس چیز پر جو دنیا میں کامیاب ہو سکتی ہو خواہ حق ہو یا باطل؟ پھر آخر یہ کیا جاہلیت کا تصور ہے کہ قرآنی نظام قائم کرنے کی جد و جہد کبھی ناکام بھی

ہو سکتی ہے؟ اس میں تو کامیابی یقینی ہے بشرطیکہ کامیابی کا وہ تصور مراد لیا جائے جو قرآن نے پیش کیا ہے نہ کہ مادہ پرستانہ تصور۔ قرآن جسے فوز و فلاح کہتا ہے اس سے تو یہ جد و جہد کبھی محروم ہی نہیں سکتی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ قرآن جس چیز کی دعوت دیتا ہے اس کے قیام کی سعی کرنا ایک سخت مشکل کام ہے، زبردست قربانی کا طالب ہے اور جب تک اس راہ میں سر دھڑ کی بازی نہ لگا دی جائے اس کے بالفعل قائم ہونے کا امکان نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کا اور کون سا وہ نظام ہے جو قربانی، جانفشانی اور سخت کوشش کے بغیر قائم ہو جاتا ہو؟ یہ دنیا تو عالم اسباب ہے۔ یہاں فطرت کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ جب تک اسباب کار مہیا نہ کیے جائیں اور کام میں پوری طرح انہماک نہ ہو اس وقت تک کوئی کام بھی یہاں بن نہیں آ سکتا غیر قرآنی مقاصد کے لیے بھی آخر آپ سب کچھ کرتے ہی ہیں۔ جان، مال، وقت اور محنت سب کچھ کھپاتے ہیں، فائدے بھی قربان کرتے ہیں اور تکلیفیں اور نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ اب یہ ایمان کا نقص نہیں تو اور کیا ہے کہ جو آپ قرآن کے مخالف نظاموں کے لیے کر سکتے وہ قرآنی نظام کے لیے نہیں کر سکتے۔

بہر حال اس دور میں ایسی ایک اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو عین "مقتضیات ایمان" پر مبنی ہو اور تمام باطل تحریکات کے علی الرغم انسانیت کے سارے مسائل کو ان اصولوں کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرے جو قرآن نے پیش کیے ہیں۔ یہ نہ صرف ایمان بالقرآن کا تقاضا ہے بلکہ فی الواقع آج دنیا کو ایسی ایک تحریک کی ضرورت بھی ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو خوش قسمتی سے اس وقت دنیا کے بین الاقوامی حالات ایسے ہیں کہ اس کا کامیاب ہونا اور آگ کی طرح پھیل جانا عین ممکن ہے بلکہ شاید ایسا نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ البتہ اس کے لیے ایک مضبوط، منظم، صادق القول، صالح جماعت کی ضرورت ہے جس کے ہر فرد کی سیرت اسی مقصد میں ڈھلی ہوئی اور اسی کے لیے جینے اور مرنے والی ہو۔

رسائل و مسائل

"حکومت الٰہیہ" اور پاپائیت کا اصولی فرق

سوال: کچھ عرصہ ہوا کہ رسالہ پیغام حق لاہور میں جناب ابو سعید بزمی صاحب کا مضمون "حکومت کا اسلامی تصور" نظر سے گذرا۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

"اسلامی سیاست کا ایک تصور وہ بھی ہے جسے حال ہی میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بڑے زور شور کے ساتھ پیش کیا ہے اور جس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ تاریخی حیثیت سے یہ اصول نیا نہیں۔ یورپ میں ایک عرصہ تک تھیاکریسی (Theocracy) کے نام سے اس کا چرچا رہا اور روم کے پاپائے اعظم کا اقتدار اسی تصور کا نتیجہ تھا۔ لیکن لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ خدا کوئی ناطق ادارہ نہیں اس لیے جس شخص کو خدا کے نام پر اختیار و اقتدار مل جائے وہ بڑی آسانی سے اس کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔ مولانا مودودی کے حلقۂ خیال کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا تصور سیاست پاپائے اعظم کے تصور سے مختلف ہے لیکن چونکہ وہ عوام کو جوابدہ قرار نہیں دیتے اور اسی بنیاد پر جمہوریت کو غلط سمجھتے ہیں اس لیے نتیجۃً ان کا تصور پاپائے اعظم ہی کا تصور ہو کر رہ جاتا ہے۔"

پھر بزمی صاحب اپنی طرف سے ایک حل پیش کرتے ہیں لیکن وہ بھی وجہ تسلی نہیں ہوتا۔ آپ براہ کرم ترجمان القرآن کے ذریعے اس غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں اور صحیح نظریہ کی توضیح کر دیں۔

جواب: بزمی صاحب نے غالباً میرا مضمون "اسلام کا نظریہ سیاسی" ملاحظہ نہیں فرمایا ہے ورنہ وہ دیکھتے کہ جو اعتراضات انھوں نے میرے مسلک پر کیے ہیں ان کا پورا جواب اس مضمون میں موجود ہے لیکن اگر انھوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے اور پھر یہ اعتراضات کیے ہیں تو میں سوائے اس کے کہ

اظہار تعجب کروں، اور کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ میرے اس مضمون میں یہ عبارتیں قابلِ ملاحظہ ہیں:

"مگر یورپ جس تھیا کریسی سے واقف ہے، اسلامی تھیا کریسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیا کریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو الٰہی حکومت کہنے کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیا کریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو الٰہی جمہوری حکومت (Theo democratic state) کے نام سے موسوم کروں گا، کیونکہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حکومت عطا کی گئی ہے۔ اس میں عامہ مسلمانوں کی رائے سے بنے گی، مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے، سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے۔ اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔"

پھر میں نے اوپر کی عبارت کے نیچے حاشیہ میں اس کی مزید تشریح کی ہے کہ:

"عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں، لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور انھیں یہ کہہ کر نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔"

کوئی شخص جو مسیحی مذہب اور پاپائیت کی تاریخ سے واقف ہے، میرے اس اشارہ کو جو میں نے

ان چند فقروں میں کیا ہے، سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ یورپ کا پاپائی نظام سینٹ پال کا پیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف اُن اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہد نامہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک سیاست کا نظام چلایا جا سکے۔ مگر جب پاپاؤں نے یورپ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ تھیاکریسی قائم کی تو اس کے لیے ایک قانون شریعت بھی وضع کیا، جو ظاہر ہے کہ کسی وحی والہام سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ خود ان کا گھڑا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے جو نظام عقائد، جو مذہبی اعمال و رسوم، جو نذریں اور نیازیں، جو معاشرتی ضوابط وغیرہ تجویز کیے تھے ان میں سے کسی کی سند بھی ان کے پاس کتاب اللہ سے نہ تھی۔ اسی طرح انھوں نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی منصب داروں کو جو ایک مستقل واسطہ قرار دے دیا تھا یہ بھی ان کا خود ساختہ تھا۔ نیز انھوں نے نظام کلیسا کے کارپردازوں کے لیے جو حقوق اور اختیارات تجویز کیے تھے اور جو مذہبی ٹیکس لوگوں پر لگائے تھے۔ ان کے لیے بھی کوئی ماخذ ان کی اپنی ہوائے نفس کے سوا نہ تھا۔ ایسے نظام کا نام چاہے انھوں نے تھیاکریسی رکھ دیا ہو، لیکن وہ فی الحقیقت تھیاکریسی نہیں تھا۔ اس کو آخر اسلام کی حکومت الٰہیہ یا شرعی حکومت سے کیا مماثلت ہو سکتی ہے جس کے لیے کتاب و سنت کی صورت میں بالکل واضح اور ناقابل حذف و ترمیم قانون موجود ہے۔

پھر زبیری صاحب کا یہ ارشاد بالکل عجیب ہے کہ ہم خلیفہ کو وہی حیثیت دیتے ہیں جو عیسائیوں میں پوپ کی حیثیت ہے، اور یہ کہ ہم اسے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے۔ اس کے جواب میں میں پھر اپنے اسی مضمون کی چند عبارتیں نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ میں نے آیت وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے استنباط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت ہے۔"

پھر آگے چل کر میں نے لکھا ہے کہ:

"یہاں ہر شخص خلیفہ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا، اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس شخص کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور دوسری طرف اُن عام خلفاء کے سامنے، جنھوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔"

اس کے بعد میں نے پھر اسی مضمون میں دوسرے مقام پر تصریح کی ہے کہ:

"اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے، اس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کر کے امانت کے طور پر اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے خلیفہ کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اس کی ذات میں مرتکز ہو گئی ہے۔"

اس کے بعد یہ فقرہ بھی میرے اسی مضمون میں موجود ہے کہ:

"امیر تنقید سے بالاتر نہ ہوگا۔ ہر عامی مسلمان اس کے پبلک کاموں ہی پر نہیں بلکہ اس کی پرائیویٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہوگا۔ وہ قابل عزل ہوگا۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوگی۔ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکے گا اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہوگا۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ مجلس شوریٰ ایسی ہوگی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس امر میں بھی کوئی مانع شرعی نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے .... ہر صورت میں عامۂ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوف خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے یا نفسانیت کے ساتھ۔ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسند امارت سے نیچے بھی اتار لا سکتی ہے۔"

ان تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی شخص ہماری تھیاکریسی کو پاپایانِ روم کی قائم کردہ تھیاکریسی سے مشابہ قرار دے تو بہرحال ہم اسے اس کی آزادیٔ رائے سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ مگر یہ ضرور عرض کریں گے کہ یہ رائے علم و دلیل سے آزاد ہے۔

کنوز کا نصابِ زکوٰۃ

سوال: تمام کتب فقہ میں مذکور ہے کہ چاندی کا نصاب زکوٰۃ دو سو درہم (۵۲½ تولہ) ہے اور سونے کا بیس دینا۔ (۷½ تولہ)۔ اور علماء فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس چاندی اور سونا دونوں ہوں اور ہر ایک نصاب مقررہ سے کم ہو تو اس صورت میں سونے کی قیمت چاندی سے لگا کر یا چاندی کی قیمت سونے سے لگا کر ——— دونوں میں سے جو صورت بھی انفع للفقراء ہو ——— مجموعہ کو دیکھیں گے۔ یہاں تک تو بات صاف ہے۔ لیکن یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر صرف چاندی ہو تو چاندی کا نصاب ہوگا اور اگر صرف سونا ہی سونا پاس ہو تو سونے کا نصاب حساب کی اساس ہوگا۔ اس بنا پر لازم آتا ہے کہ اگر کسی کے پاس صرف ساٹھ روپیہ ہے تو اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ مگر جس کے پاس صرف چھ تولہ سونا ہے وہ زکوٰۃ سے بری ہے حالانکہ مالدار ہونے کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو موجودہ نرخ کے اعتبار سے وہ تقریباً ۵۰۰ روپیہ کا مالک ہے۔ بہرحال علماء کے فتوے شخص اول پر زکوٰۃ فرض قرار دیتے ہیں اور شخص ثانی پر زکوٰۃ عائد ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن کم مالدار سے اخذِ زکوٰۃ اور کثیر المال کو چھوڑ دینا تعجب انگیز بات ہے۔ میں تو اپنی جگہ یہ سمجھا ہوں کہ زمانۂ قدیم میں چاندی اور سونے کی مالیت میں وہ نسبت نہ تھی جو آج کل ہے۔ آج کل تو ۱ = ۷۰، یا ۱ = ۸۰ کی نسبت ہے مگر دورِ نبوی میں تقریباً ۱ = ۷ کی تھی۔ زکوٰۃ کی فرضیت میں مالیت کا اعتبار کیا گیا ہے اور ۱۴۰ مثقال چاندی کنوز کا بنیادی نصاب زکوٰۃ ہے۔ نبی صلعم نے زکوٰۃ کا نصاب معین کرتے ہوئے اسی چاندی کی مقدار کو ذکر فرمایا۔ اس دور میں ۱۴۰ مثقال چاندی کی مالیت کا سونا چونکہ ۲۰ مثقال (۷½ تولہ) ہی بنتا تھا، اس لیے یہ نصاب قرار پا گیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ

تا قیامت سونے کی زکوٰۃ کے لیے ۷½ تولہ ہی مستقل نصاب معین رہے۔ بلکہ سونے کی وہ مقدار نصاب زکوٰۃ ہوگی جو ۵۲½ تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہو یعنی جس شخص کے پاس صرف سونا ہو وہ اس کی قیمت لگا کے دیکھے کہ اگر وہ ۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جاتی ہے یا اس سے بڑھ جاتی ہے تو اس پر زکوٰۃ ادا کرے ہے۔ میرے اس خیال کی تائید نہ کسی کتاب کی فقہی عبارات کرتی ہیں نہ علمائے وقت ہی اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں، اس وجہ سے مجھے اپنی رائے پر اعتماد نہیں ہے۔ آپ جس پہلو کو مرجح قرار دیں میرے لیے موجب اطمینان ہوگا

جواب: (۱) آپکا خیال اس حد تک تو درست ہے کہ نبی صلعم کے زمانہ میں چاندی اور سونے کی نسبت، وہی تھی جو نصاب کی مقدارت معلوم ہوتی ہے، یعنی ۵۲½ تولہ چاندی = ۷½ تولہ سونا۔ لیکن آپ کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ اب نسبتوں میں جو عظیم الشان فرق ہوگیا ہے اس کی بنا پر چاندی یا سونے کے نصاب کو تبدیل کر دیا جائے۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:

(۱) یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اصل سونے کو قرار دیا جائے یا چاندی کو، یعنی سونے کا نصاب چاندی کی قیمت کے معیار پر گھٹایا بڑھایا جاتا رہے یا اس کے برعکس، جس چیز کو بھی معیار قرار دیا جائے گا وہ ایک غیر شرعی چیز ہوگی، کیونکہ شارع نے دونوں کا حکم مستقلاً الگ الگ بیان کیا ہے اور کوئی اشارہ تک ایسا نہیں ہے جس سے یہ بات نکلتی ہو کہ سونے اور چاندی میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لیے معیار قرار دیا جائے۔

(۲) سونے اور چاندی کی قیمتوں میں نسبتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں اور ان دائمی تغیرات کی وجہ سے کوئی ایک مستقل شرعی حکم باقی نہیں رہتا۔ اگر سونے اور چاندی کی مقداروں کے بجائے کسی ایک کے نصاب کو دوسرے کی آئے دن بدلنے والی قیمتوں پر موقوف کر دیا جائے۔

(۳) جو مشکل آپ نے سونے اور چاندی کے معاملہ میں بیان کی ہے وہی بکریوں، اونٹوں، گایوں بھینسوں اور گھوڑوں کے نصاب میں بھی پیش آتی ہے۔ کیونکہ ان کی قیمتوں کی باہمی نسبتوں میں بھی مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بہت بڑا فرق ہوتا رہتا ہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے

کسی کی قیمت کو اصل قرار دے کر دوسری انواع کے نصاب کو اس کے مطابق بنایا جائے

اس لیے میری رائے میں مناسب یہی ہے کہ جن جن اشیا کی زکوٰۃ کے لیے جو نصاب شارع نے مقرر کر دیا ہے، اور جس مقدار یا تعداد پر جو زکوٰۃ عائد کر دی ہے اس کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔

مسئلۂ مہدی

سوال: چند حضرات نے جو نہایت دیندار و مخلص ہیں۔ تجدید و احیائے دین کی ان سطور کے متعلق جو آپ نے امام مہدی کے متعلق تحریر فرمائی ہیں، احادیث کی روشنی میں اعتراضات پیش فرمائے ہیں، جنھیں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ میں اس احساس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ دعوتِ اقامت دین کے پورے کام میں شریعت کی پابندی ضروری ہے، پس لازم ہے کہ ہر وہ چیز جو آپ کے قلم سے نکلے، عین شریعت کے مطابق ہو اور اگر کبھی کوئی غلط رائے تحریر میں آئے تو اس سے رجوع کرنے میں کوئی تامل نہ ہونے پائے۔

امام مہدی کے متعلق جو سطور آپ نے ص۱۲ تا ص۳۳ تحریر فرمائی ہیں وہ ہمارے فہم کے مطابق احادیث کے خلاف ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے ترمذی ابوداؤد کی تمام روایات کا مطالعہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایات کے راوی خود خارجی یا شیعہ ہیں لیکن ابوداؤد و ترمذی وغیرہ کے ہاں ایسی صحیح احادیث بھی موجود ہیں جن کے راوی ثقہ اور صدوق ہیں اور وہ آپ کی رائے کی تصدیق نہیں بلکہ تردید کرتی ہیں۔ مثلاً ابوداؤد کی روایت ملاحظہ ہو۔

حدثنا محمد بن المثنیٰ...... عن ام سلمۃ زوج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال یکون اختلاف عند موت خلیفۃ فیخرج رجل من اھل المدینۃ ھاربًا الی مکۃ فیاتیہ ناس من اھل مکۃ فیخرجونہ وھو کارہ فیبایعونہ بین الرکن والمقام.......... (کتاب المہدی)۔

اس روایت سے لے کر آخیر روایت تک ملاحظہ ہو تمام راوی ثقہ ہیں۔ نیز بیہقی کی بھی ایک روایت مشکوٰۃ کی کتاب الفتن میں تحریر ہے:۔

عن ثوبان قال اذا رأیتم الرایات السود قد جاءت من قبل خراسان
فأتوها فان فیها خلیفۃ اللہ المہدی

مندرجہ بالا احادیث سے آپ کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ المہدی کو اپنے مہدیٔ موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی۔ خصوصاً یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

وجب علیٰ کل مومن نصرہ او قال اجابتہ

نیز ترمذی کی ایک روایت کے یہ الفاظ بھی دیکھیے:

قال فیجیٔ الیہ الرجل فیقول یا مہدی! اعطنی اعطنی! قال فیحثی
لہ فی ثوبہ ما استطاع ان یحملہ

(۲) جناب نے فرمایا ہے کہ مہدیٔ موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا...... وغیرہ! آپ کے ان الفاظ کی کوئی سند احادیث میں نہیں ہے۔ اگر ہو تو تحریر فرمائیں۔ جو لوگ آپ کے برعکس خیالات رکھتے ہیں ان کی واقعاتی دلیل یہ ہے کہ اب تک جتنے مجددانِ امت گزرے ہیں وہ عموماً صوفیائے کرام کے طبقہ میں ہوئے ہیں۔

(۳) جناب کی ان سطور سے کہ وہ جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، یہ شبہہ کیا جارہا ہے کہ آپ خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے۔

(۴) کتاب "علامات قیامت" (مؤلفہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب و مترجمہ مولوی نور محمد صاحب) میں امام مہدی کے متعلق مسلم و بخاری کے حوالے سے چند روایات درج ہیں، لیکن تحقیق کرنے پر مسلم و بخاری میں مجھے اس قسم کی کوئی حدیث نہ مل سکی۔ اسی کتاب میں ایک روایت یہ بھی درج ہے کہ بیعت مہدی کے وقت آسمان سے یہ ندا آئے گی کہ "ھذا خلیفۃ اللہ المہدی فاسمعوا لہ واطیعوا"۔ اس روایت کے متعلق آپ کی تحقیق کیا ہے؟

جواب: (۱) امام مہدی کے متعلق جو احادیث مختلف کتب حدیث میں مروی ہیں ان کے متعلق میں اپنی تحقیق کا خلاصہ ترجمان القرآن جلد ۲۶ عدد ۳، ۴، ۵، ۶ میں عرض کرچکا ہوں۔ جو لوگ امام مہدی

کے متعلق کسی روایت کو ماننے کے لیے اتنی بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ وہ حدیث کی کسی کتاب میں درج ہے یا تحقیق کا حق ادا کرنے کے لیے صرف اس مرحلہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ راویوں کے متعلق یہ معلوم کریں کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں، ان کے لیے یہ درست ہے کہ اپنا وہی عقیدہ رکھیں جو انھوں نے روایات میں پایا ہے۔ لیکن جو لوگ ان روایات کو جمع کر کے ان کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں اور ان میں بکثرت تعارضات پاتے ہیں، نیز جن کے سامنے بنی فاطمہ اور بنی عباس اور بنی امیہ کی کشمکش کی پوری تاریخ ہے اور وہ صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ اس کشمکش کے فریقوں میں سے ہر ایک کے حق میں متعدد روایات موجود ہیں اور راویوں میں سے بھی اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں جن کا ایک نہ ایک فریق سے کھلا ہوا تعلق تھا، ان کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ ان روایات کی ساری تفصیلات کو صحیح تسلیم کر لیں۔ خود آپ نے جو احادیث نقل کی ہیں ان کے اندر بھی "رایات السود" یعنی کالے جھنڈوں کا ذکر موجود ہے۔ اور تاریخ سے معلوم ہے کہ کالے جھنڈے بنی عباس کا نشان تھے نیز یہ بھی تاریخ سے معلوم ہے کہ اس قسم کی احادیث کو پیش کر کر کے خلیفہ مہدی عباسی کو مہدی موعود ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اب اگر کسی کو ان چیزوں کے ماننے پر اصرار ہے تو وہ مانے اور تجدید احیائے دین میں میں نے جس رائے کا اظہار کیا ہے اس کو رد کر دے۔ کچھ ضروری نہیں ہے کہ ہر تاریخی، علمی اور فقہی مسئلہ میں میری ایک بات سب لوگوں کے لیے قابل تسلیم ہو۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ان مسائل میں میری کوئی تحقیق کسی کو پسند نہ آئے تو اصل دین کی سعی اقامت میں بھی میرے ساتھ تعاون کرنا اس کے لیے حرام ہو جائے۔ آخر یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ علوم میں اہل علم کی رائیں مختلف ہوئی ہوں۔

(۲) میں نے یہ جو بات کہی ہے کہ مہدی موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ڈاڑھی منڈوائے گا، کوٹ پتلون پہنے گا، اور اپ ٹو ڈیٹ فیشن میں رہے گا۔ بلکہ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جس زمانہ میں بھی پیدا ہوگا اُس زمانہ کے علوم سے، حالات سے اور ضروریات سے پوری طرح واقف ہوگا، اپنے زمانہ کے مطابق عملی تدابیر اختیار کرے گا اور ان تمام آلات و وسائل سے کام لے گا جو اس کے دور میں سائنٹفک تحقیقات سے دریافت ہوئے ہوں۔ یہ تو ایک صریح عقلی بات ہے جس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر نبی صلعم اپنے زمانہ کی تدابیر مثلاً خندق، دبابہ، منجنیق وغیرہ استعمال فرماتے

تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ کسی دور میں جو شخص حضورؐ کی جانشینی کا حق ادا کرنے اٹھے گا وہ ٹینک اور ہوائی جہاز سے، سائنٹفک معلومات سے اور اپنے زمانہ کے احوال و معاملات سے بے تعلق ہو کر کام کرے گا۔ کسی جماعت کے حصولِ مقصد اور کسی تحریک کے غلبہ کا فطری راستہ یہی یہی ہے کہ وہ قوت کے تمام جدید ترین وسائل کو قابو میں لائے اور اپنا اثر پھیلانے کے لیے جدید ترین علوم و فنون اور طریقہ ہائے کار کو استعمال کرے۔

(۳) یہ ارشاد کہ "اس سے شبہہ کیا جا رہا ہے کہ تو خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرے گا"۔ اس کے جواب میں بجز اس کے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہو سکتا جو خدا سے ڈرتا ہو، جسے خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی یاد ہو کہ "اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ"۔ جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو جماعت اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں، میں نے اُن کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہیں کر سکیں گے، اور وہ سزا یہ ہے کہ انشاء اللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی اور ان کو بیان کر کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔

(۴) کتاب علامات قیامت میں جس روایت کا ذکر ہے، اس کے متعلق میں نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ صحیح ہے اور فی الواقع حضورؐ نے یہ خبر دی ہے کہ مہدی کی بیعت کے وقت آسمان سے ندا آئے گی کہ "ھٰذا خلیفۃ اللہ المھدی فاستمعوا لہ واطیعوا" تو یقیناً میری وہ رائے غلط ہے جو تجدید و احیائے دین میں میں نے ظاہر کی ہے۔ لیکن مجھے توقع نہیں ہے کہ حضورؐ نے ایسی بات فرمائی ہو گی۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نبی کی آمد پر بھی آسمان سے ایسی ندا نہیں آئی۔ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، جو آخری نبی تھے اور نوعِ انسانی کے لیے جن کے بعد کفر و ایمان کے فیصلہ کا کوئی دوسرا موقع آنے والا نہ تھا، آپ کی آمد پر بھی ایسی کوئی ندا آسمان سے نہ سنی گئی۔ مشرکین مکہ مطالبہ کرتے ہی رہے کہ آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ ہونا چاہیے جو ہمیں خبردار کرے کہ آپ خدا کے نبی ہیں یا اور کوئی صریح بات

ایسی ہونی چاہیے جس سے یقینی اور غیر مشتبہ طور پر ہمیں آپ کا نبی ہونا معلوم ہو جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سارے مطالبوں کو رد فرما دیا، اور انھیں قبول نہ کرنے کی وجہ بھی متعدد مقامات پر قرآن میں ظاہر کر دی کہ حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینا جس سے عقلی آزمائش و امتحان کا کوئی موقع باقی نہ رہے، حکمت خداوندی کے خلاف ہے۔ اب یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس سنت کو صرف امام مہدی کے معاملہ ہی میں بدل دے گا اور ان کی بیعت کے وقت آسمان سے منادی کرائے گا کہ "لوگو یہ ہمارا خلیفہ مہدی ہے اس کی سنو اور اطاعت کرو"!

تحریک اسلامی کے متعلق چند شبہات

سوال: ہماری دعوت اسلامی پر کچھ سنجیدہ اصحاب کی طرف سے حسب ذیل چند اعتراضات پیش کیے گئے ہیں۔ براہ کرم اپنے جوابات سے آگاہ فرمایئے:۔

(۱) جماعت اسلامی کی تحریک سے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ بن جائے گا۔ اس خطرہ کا کیا سد باب کیا گیا ہے۔

(۲) یہ تحریک ابن عبد الوہاب نجدی ہی کی تحریک ہے۔ جب آپ کے ساتھ اچھی خاصی جمعیت ہو جائے گی تو آپ کا رویہ بھی ابن عبد الوہاب ہی کی طرح ہو گا۔

(۳) آپ بزرگان دین کا احترام بھی نہیں کرتے۔ سلف کے جن حضرات نے بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں ان کی کارگذاریوں پر آپ قلم پھیر دینا چاہتے ہیں اور خود کو ان سے بہتر کام کرنے کا اہل پاتے ہیں۔

(۴) آپ ارکان جماعت اسلامی کے سوا باقی سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔

جواب: میں اپنی حد تک انتہائی احتیاط کر رہا ہوں اور میرے رفقا بھی خدا کے فضل سے اس معاملہ میں چوکنے ہیں کہ ہماری یہ جماعت مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ بننے نہ پائے۔ اگرچہ ہم سے اختلاف کرنے والوں میں سے ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہم سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے جس سے ہم کو بھی ایک فرقۂ جدیدہ بنا ڈالا جائے، لیکن الحمد للہ کہ ہمارے اندر نہ اس کی کوئی خواہش ہے، نہ ارادہ

اور ہم اس فتنہ سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے بس میں ہے ہم اس خطرہ کا سدباب کر رہے ہیں لیکن شیطان کی شرارتوں کا ایسا کامل سدباب کہ اسے کسی طرح گھس آنے کا موقع نہ ملے انبیاء علیہم السلام بھی نہ کر سکے تو ہم کیا چیز ہیں کہ اس میں پوری طرح کامیاب ہونے کا دعویٰ کر سکیں۔ بندے کا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اپنی حد امکان تک کوشش کرے اور آگے کے لیے اللہ سے دعا مانگے۔

(۲) ہمارا لٹریچر اور کام کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ ابن عبدالوہاب نجدی کی تحریک ہے یا آگے چل کر وہی کچھ بن جائے گی تو وہ اپنی رائے کا مختار ہے۔ ہم کسی شخص کو رائے رکھنے کے اختیار سے محروم نہیں کر سکتے۔

(۳) میں تمام بزرگانِ دین کا احترام کرتا ہوں۔ مگر پرستش ان میں سے کسی کی نہیں کرتا، اور انبیاء کے سوا کسی کو معصوم بھی نہیں سمجھتا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں بزرگانِ سلف کے خیالات، اور کاموں پر بے لاگ تحقیق و تنقید کی نگاہ ڈالتا ہوں۔ جو کچھ ان میں حق پاتا ہوں اسے حق کہتا ہوں اور جس چیز کو کتاب و سنت کے لحاظ سے یا حکمت عملی کے اعتبار سے درست نہیں پاتا اس کو صاف صاف نادرست کہہ دیتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی غیر نبی کی رائے یا تدبیر میں خطا پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عظمت و بزرگی میں کوئی کمی آئے۔ اس لیے میں سلف کی بعض رایوں سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کی بزرگی کا بھی قائل رہتا ہوں اور میرے دل میں ان کا احترام بھی بدستور باقی رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ بزرگی اور معصومیت کو ہم معنی سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک اصول یہ ہے کہ جو بزرگ ہے وہ خطا نہیں کرتا اور جو خطا کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بزرگ کی رائے یا طریقہ کو نادرست قرار دینا لازمی طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ ایسا خیال ظاہر کرنے والا ان کی بزرگی کا احترام نہیں کرتا اور ان کی خدمات پر قلم پھیرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اس مقام پر بھی نہیں رکتے، بلکہ آگے بڑھ کر اس پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھتا ہے۔ حالانکہ علمی معاملات میں ایک شخص کا دوسرے کی رائے سے اختلاف کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ جس سے اختلاف کر رہا ہو اُس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا بھی سمجھے اور بہتر بھی۔ امام محمد اور امام ابو یوسف نے بکثرت معاملات میں امام ابو حنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے

اور ظاہر ہے کہ یہ اختلاف یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ مختلف فیہ معاملات میں اپنی رائے کو صحیح اور امام صاحب کی رائے کو غلط سمجھتے تھے۔ لیکن کیا اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ دونوں حضرات امام ابو حنیفہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو افضل سمجھتے تھے؟

(۴) یہ الزام کہ ہم ارکانِ جماعت اسلامی کے سوا باقی سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں، اگر ہمارے ان تمام تحریرات کو پڑھنے کے بعد لگایا گیا ہے جو ہم نے اس الزام کی تردید میں بار بار لکھی ہیں تو اس کا کوئی جواب صبر کے سوا نہیں ہے۔ آخر سارے معاملات کا فیصلہ اسی دنیا میں تو نہیں ہو جاتا ہے، کوئی عدالت آخرت میں بھی تو قائم ہو گی۔

الکوہل آمیز ادویہ کا استعمال

سوال: اس زمانہ میں انگریزی ادویہ جو عام طور پر رائج ہیں ان میں سے ہر رقیق دوا میں الکوہل (شراب کا جوہر) شامل ہوتا ہے۔ میں ان سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن عرض یہ ہے کہ خمر کی تحریم کے متعلق جو حکم قرآن شریف میں ہے اس میں اگر خمر کا مطلب "نشہ آور چیز" لیا جائے تو دوا میں الکوہل اتنا کم ہوتا ہے کہ نشہ نہیں کرتا اور نہ کوئی اس مقصد سے پیتا ہے، نہ اس ترکیب سے اپنے لیے حلال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں باریک بینی کی جائے تو ڈبل روٹی میں بھی آٹے کا خمیر اٹھنے پر کچھ الکوہل بن جاتا ہے اور شربت جو بوتلوں میں آتے ہیں ان میں بھی کچھ الکوہل ضرور بن جاتا ہے، بلکہ باسی انگوروں میں بھی بنتا ہے۔ اگر ان صورتوں میں کوئی وجہ حرمت نہیں تو دار ہوتی تو آخر صرف دواہی کے اندر الکوہل کی شمولیت کیوں اتنی زیادہ قابلِ توجہ ہو؟ نیز اگر باعتبار لغت خمر کا مطلب انگوری شراب لیا جائے تو الکوہل انگوری شراب نہیں ہے اس لیے انگریزی ادویات ناجائز نہ ہونی چاہئیں۔ لیکن علما نے اس زمانہ میں جب ایسی ادویات سامنے نہیں تھیں ایسے سخت فتوے دیدیے کہ آج انھیں مختلف مواقع پر چسپاں (Apply) کرنے سے بڑی مشکل پیش آ رہی ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ آج کل یونانی ادویہ مرکبہ کا خالص حالت میں دستیاب ہونا بہت ہی دشوار ہے۔ خمیرہ مروارید میں بڑے سے بڑا متقی دواساز بھی مروارید کی جگہ تھوڑی سی صدف ملا دیتا ہے۔ نیز جانیں بچانے کے لیے جب لوگ زیادہ ترقی یافتہ انگریزی طب اور جراحی کے ماہرین کی طرف متوجہ ہوتے

پر مجبور ہیں تو آخر وہ یونانی ادویہ تجویز کر دینے سے رہے۔ ان سارے پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر آپ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: خمر اگرچہ انگوری شراب کو کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد ہر نشہ آور چیز ہے۔ چنانچہ خمر کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "الخمر ما خامر العقل" یعنی ہر وہ چیز خمر ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔ اور شریعت میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ "ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام" یعنی جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔ یہ کم مقدار کی حرمت نشہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کم مقدار استعمال کر لینے سے نفس کے اندر کی وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے، یا کم از کم کمزور پڑ جاتی ہے، جو حرام چیز کے لیے نفس میں موجود ہوتی ہے۔

پھر یہ بات علمی طریق پر معلوم ہے کہ تمام شرابوں میں وہ اصل چیز جو نشہ پیدا کرنے والی ہے، الکوہل ہی ہے۔ اس لیے کسی صورت میں اس کا استعمال جائز تو نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایسے حالات میں جب کہ فن طب کی ترقی مسلمانوں کے ہاں ایک مدت سے بند ہو چکی ہے، اور جدید زمانہ میں اس فن کی تمام ترقیات ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوئی ہیں جو حرام و حلال کی تمیز سے خالی ہیں۔ اور انھوں نے نئے زمانہ کی بیشتر موثر دوائیں میں الکوہل کو ایک اچھا محلل پا کر دواسازی میں بکثرت استعمال کیا ہے، افراد کے لیے اضطرار کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ شریعت کسی انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ وہ اپنی صحت اور اپنی زندگی کی حفاظت کے صرف ان ذرائع پر انحصار کرے جو کسی خاص زمانہ تک دریافت ہوئے ہوں اور اس زمانہ کے بعد دریافت ہونے والے ذرائع خواہ کتنے ہی کارگر اور مفید ہوں، ان سے اجتناب کر کے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے۔ اس لیے افراد تو اضطرار کی بنا پر ان ذرائع میں حرمت کا سبب موجود ہوتے ہوئے بھی ان کو اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، لیکن تمام مسلمان بحیثیت مجموعی اس وقت تک اس گناہ کے ذمہ دار بنتے رہیں گے جب تک وہ فن طب اور دواسازی کی جدید ترقیات کو مسلمان بنا لینے کی اجتماعی کوشش نہ کریں۔

جدید فن طب اور دواسازی کو مسلمان بنانے سے میری مراد یہ ہے کہ اس فن کی تمام موجودہ اور آئندہ ترقیات کو اسلام کے اصول اخلاق کا پابند بنایا جائے اور دواسازی کے تمام موجودہ اور آئندہ ترقی پذیر ذرائع کو اسلامی حدود کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ یہ کام جب تک اجتماعی سعی سے نہ ہوگا افراد تو اضطرار کی وجہ سے معاف ہوتے رہیں گے، لیکن جماعت کے نامۂ اعمال میں مسلسل گناہ لکھا جاتا

رہے گا۔ اجتماعی گناہوں کی یہی خاصیت ہے کہ ان کی وجہ سے افراد کے لیے انفرادی طور پر انحراف کی حالت پیدا ہو جاتی ہے، مگر اجتماعی طور پر پوری جماعت گنہ گار قرار پاتی ہے۔

مزدوروں کی ہڑتالوں میں جماعت اسلامی کی پالیسی

سوال: آج کل ملک میں ہڑتالوں کا دور دورہ ہے۔ ہم لوگ جو جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں اور محنت پیشہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے موقع پر کیا روش اختیار کریں جبکہ ہمارے کارخانے یا محکمے میں ہڑتال ہو؟

جواب: اس معاملہ میں سردست ہماری پالیسی یہ ہے کہ جو مزدور یا محنت پیشہ لوگ ہمارے مسلک سے متاثر ہوں وہ ہڑتال کے زمانہ میں کام پر تو نہ جائیں لیکن ہڑتالیوں کے ہنگاموں سے بھی الگ تھلگ رہیں۔ نیز جن مطالبات کے لیے ہڑتال کی گئی ہو ان کے متعلق یہ رائے قائم کریں کہ آیا وہ منصفانہ ہیں یا غیر منصفانہ۔ اگر منصفانہ ہوں تو پُرامن اور معقول طریقہ سے ان کو تسلیم کرانے میں حصہ لیں مگر کسی فساد اور جھگڑے میں حصہ نہ لیں۔ اور اگر وہ غیر منصفانہ ہوں تو اپنے ہم پیشہ ہڑتالیوں سے صاف کہہ دیں کہ ہم تمھارے خلاف کام پر تو نہیں جائیں گے لیکن ہم تمھارے مطالبات کو انصاف پر نہیں سمجھتے۔ اور اگر ان کا کوئی حصہ منصفانہ اور کوئی حصہ غیر منصفانہ ہو تو ہڑتالیوں اور مستاجر (Employer) دونوں کو مطلع کر دیں کہ ہم ان مطالبات کے اتنے حصے سے اتفاق اور اتنے حصے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ علاوہ بریں جن ہڑتالوں میں سوشلزم کے نظریات کارفرما ہوں ان کے متعلق صاف صاف اس بات کا اظہار کریں کہ ہم ان نظریات میں اپنی اور دوسرے انسانوں کی فلاح نہیں پاتے۔

مطبوعات

عہد نبوی میں نظامِ حکمرانی از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن۔

شائع کردہ مکتبہ جامعہ، دہلی۔ کاغذ، جلد، گردپوش مناسب، طباعت جنگ زدہ۔ قیمت: ہے/

یہ ایک تحقیقی کتاب ہے اور خوب "پڑھ کر" لکھی گئی ہے۔ بہت اچھی معلومات کو جناب مولف نے دور دور سے جمع کرکے مرتب کیا ہے، مگر حقیقۃً یہ "کتاب" نہیں ہے کہ ایک موضوع سے متعلق مباحث پر خود اس موضوع کے تقاضوں سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا گیا ہو، بلکہ دراصل یہ چند مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے عنوان کو دیکھ کر جن مباحث کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے ان میں سے بعض بالکل ناپید ہیں اور بعض بہت تشنہ ہیں۔

"شہری مملکتِ مکہ" میں عہدِ جاہلیت کا وہ نظامِ سیاسی و اجتماعی بالتفصیل پیش کیا گیا ہے جو ام القریٰ کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی نظام پر بھی نظر ڈالی گئی ہے، کیونکہ مذہب (جیسا کچھ بھی اس وقت تھا) نظامِ سیاسی پر خوب اچھی طرح موثر تھا؛ پھر تمدن کے دوسرے اہم پہلو مثلاً تجارتی، عسکری، سفارتی، مالیاتی نظام بھی مجملاً بیان کر دیے گئے ہیں۔ "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" بھی نہایت اہم مضمون ہے۔ یہ دستور دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک میں مدینہ کی دنیٰ ریاست کے اندر مسلمانوں کے حقوق متعین کیے گئے ہیں اور دوسرے میں معاہد اور حلیف یہودیوں وغیرہ کے حقوق کا تذکرہ ہے جو بطور معاہدہ مقرر کیے گئے تھے۔ یہ "دستور" مغربی زبانوں میں مدت سے شائع ہو چکا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب نے اسے اردو میں عربی ماخذ کا براہ راست مطالعہ کرکے منتقل کیا ہے اور واقعۃً یہ ایک قابل قدر کام ہے۔ مقالہ کے آغاز میں وقت کے سیاسی ماحول کی جھلک دکھا دی گئی ہے، جس کی روشنی میں اس دستور کے مطالعہ سے نبیؐ کی فوق العام سیاسی بصیرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد "قرآنی تصورِ مملکت" اہم ترین مضمون سامنے آتا ہے، مگر یہی وہ موضوع ہے جس کا حق ادا کرنا شاید محض ایک "محقق" کا کام نہیں، بلکہ "مبلغ" کے لیے مخصوص ہے۔

اسلام کے نظامِ سیاسی پر قلم اٹھانے والے کا اولین موضوع ہو ہی سکتا ہے کہ وہ اس نظریہ کو اجاگر کرے جو اپنے مومنین کو دوسرے تمام نظریوں پر قائم ہونے والے سیاسی نظاموں سے لڑا دیتا ہے۔ ہم بافسوس یہ عرض کریں گے کہ ڈاکٹر صاحب قرآن کے تصورِ مملکت کو پوری طرح واضح نہیں کر سکے۔ بلکہ کچھ عجب نہیں کہ اسے ابھی وہ سمجھے بھی نہ ہوں، کیونکہ یہ انقلابی نظریہ جو "لاالٰہ" سے ابھر کر "ان الحکم الا للّٰہ" تک پہنچتا ہے محض علمی تحقیق (Research work) کا حاصل نہیں ہے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ کمان حقیقت سے چھوٹا ہوا تیر جس دل و جگر کو چھید گیا، چھید گیا!

اس باب میں یہ تفصیل ہونی چاہیے تھی کہ نظریہ توحید اور نظریہ حاکمیت الٰہیہ کیا ہے، اس کے وسیع مقتضیات کیا کیا ہیں، اس کی بنیاد پر جو ریاست بنتی ہے وہ غیر الٰہی ریاستوں کے مقابلہ میں کیا فوقیتیں رکھتی ہے اور اس سے کہاں تک غیر الہامی نظریہ ہائے سیاسی کی پیدا کردہ گتھیاں سلجھتی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کسی دوسرے لکھنے والے کے لیے باقی رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس بحث میں یہ عجیب نظریہ سامنے آتا ہے کہ آدمؑ کے بعد کئی نسلوں اور کئی صدیوں تک مملکت کا کوئی تنظم نہ تھا، بلکہ فقط انبیاء کی نصیحتوں سے ایک اخلاقی نظام بن جاتا تھا اور سیاسی نظام اور اقتدار کی ضرورت مدتوں تک کبھی پیش نہ آئی۔ حالانکہ سیاسی نظام، چاہے اس کی شکل اور وسعت کیسی ہی کیوں نہ ہو، اجتماعی زندگی کا ایک طبعی لازمہ ہے۔ اسی غلط تصور کے تحت ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ بھی ہے کہ ابتداءً ایک قوم کی جانشین دوسری قوم بنتی تھی، نہ کہ ایک نوعیت کی مملکت دوسری نوعیت کی مملکت کی جگہ لیتی ہو۔ یہ بالکل غلط تصور ہے۔ پھر قصۂ طالوت سے یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے کہ یہودیوں نے اپنے پیغمبر سے نبوت اور بادشاہت یا مذہب اور ریاست کے الگ الگ ہونے کو سرکاری طور پر مصدقہ کرالیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ یہ رائے بھی غلط ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے اقتدار اجتماعی میں کوئی "اشتراک" کیا تھا۔ "اشرکہ فی امری" کی دعا کا مدعا تو صرف یہ تھا کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے رفیق کار اور نائب کار ہو جائیں۔ مگر ان چند کوتاہیوں کے عرض کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ پورا باب ناقابلِ استفادہ ہے۔ نہیں۔ اس میں شعورِ حقیقت کی بھی کافی جھلک موجود ہے اور بیعت، شوریٰ، قانون سازی، عدلیہ، جہانبانی، جانشینی وغیرہ جیسے اہم مسائل پہ بھی مختصر مگر

مفید بحثیں درج ہیں ـــــ اگرچہ نامکمل ہیں!

اس کے بعد "اسلامی عدل گستری"، "عہد نبوی کا نظام تعلیم"، "جاہلیت عرب کے معاشی نظام کا اثر مملکت اسلامیہ پر"، "عہد نبوی میں سیاست کاری کے اصول"، "تالیف قلبی"، "ہجرت یا نوآبادکاری" اور "آنحضرت اور جوانی" بھی قابل قدر بحثیں ہیں، جن میں بہت سا ایسا مواد ہے جو اردو داں طبقہ کے سامنے کبھی نہیں آیا۔ کتاب اس قابل ہے کہ علمی ذوق رکھنے والے اصحاب اس کا مطالعہ کریں۔

God Soul & Universe in Science and Islam

از سر محمد یامین خاں سی، آئی، ای۔ قیمت: دو روپے آٹھ آنے۔

شائع کردہ:۔ شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور۔

اس انگریزی کتاب میں خدا، روح، حشر و نشر، وحی، نبوت وغیرہ کی سائنٹفک توضیح کرنے کی سعی کی گئی ہے، مگر اس سعی کو کامیاب کہنے میں ہمیں تامل ہے۔ پوری بحث کی گاڑی اسی "سائنٹفک تفلسف" کی پٹڑی پر چلائی گئی ہے جس کو سر سید خاں مرحوم کے اسکول نے اسلامیات کی دنیا میں بچھایا تھا۔ الہامی حقائق کو پیش کرنے کے لیے نہ تو کمسٹری کی لیبارٹری کے آلات موزوں ہیں اور نہ ارسطو اور افلاطون کی منطق بازی اور فلسفہ آرائی۔ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور اس کی ایک علیحدہ حکمت ہے۔ اس حکمت کو انبیا سے حاصل کرنا چاہیے۔ مگر نیک نیت مؤلف سر محمد یامین نے خود ہی یہ معذرت کر دی ہے کہ وہ اسلامیات میں مہارت نہیں رکھتے۔ اس کے ساتھ ان کی کتاب بتاتی ہے کہ وہ فلسفہ سے بھی کچھ زیادہ استفادہ نہیں کر سکے ہیں۔ پس کچھ عجب نہیں کہ ان کی سعی کا تیر نشانے پر نہ بیٹھا ہو۔

زبان سادہ اور عام فہم تر ہے مگر محاورہ کی لغزشیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مصنف نے خدا کے واحد ہونے کو "Unit" (یعنی اکائی) کے لفظ سے ادا کرنے میں "جسارت" سے تو کام نہیں لیا ہے؟

فلکیات وغیرہ کے متعلق جو کچھ معلومات جمع کی گئی ہیں وہ خوب دلچسپ ہیں۔

نبوت کا ظہور اتم

از خواجہ کمال الدین مرحوم۔ قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ: مسلم بک سوسائٹی، عزیز منزل، برانڈرتھ روڈ۔ لاہور

خواجہ کمال الدین نے جو اسلامی لٹریچر پیدا کیا تھا اس کا ایک اہم حصہ یہ کتاب بھی ہے۔ اس میں سیرت نبوی کو پیش کیا گیا ہے۔ احمدی لٹریچر کی خصوصیتیں، یعنی مغرب سے تاثر اور اسلام کی طرف سے "دعوتی" نہیں، بلکہ "جواب دعویٰ" سا پیش کرنا اور اس کے ساتھ اسلام کو ایک تہذیبی انقلاب کی تحریک کے بجائے ایک "پرامن" اخلاقی سالک بنا کر پیش کرنا، اس کتاب کے حصہ میں بھی آئی ہیں۔ تاہم یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسے پڑھ کر کچھ استفادہ ہی نہ کیا جا سکے۔

ہمارے پیش نظر ۱۹۳۳ء کے ایڈیشن کی ایک جلد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے رحم زمانہ اسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا

"البیان" کا "ختم نبوت نمبر" مرتبہ:۔ محمد اقبال سلمانی صاحب۔ قیمت عہ۔ صفحات ۱۸۴۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر امت مسلمہ (ہند) امرتسر۔

اس خاص نمبر میں مختلف حضرات کے وہ مضامین جمع کیے گئے ہیں جن میں قادیانی نظریۂ نبوت کی تردید اور عقیدۂ ختم رسالت کا اثبات کیا گیا ہے۔ سید رشید رضا مصری، علامہ اقبال مرحوم، مولانا آزاد، مولانا سندھی مرحوم، سید سلیمان ندوی کے افکار بھی اس میں شامل ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ حدیث کی مخالفت کا زہر اس میں بھی موجود ہے۔

"نئی زندگی" کا پاکستان نمبر مرتبہ ڈاکٹر سید محمود۔ قیمت [illegible] ضخامت ۸۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ دفتر نئی زندگی۔ الہ آباد

نئی زندگی کے اس نمبر کا اشتہار تو یہ بتاتا تھا کہ یہ نمبر پاکستان کے موضوع پر دو طرفہ آرا اور رجحانات کا مجموعہ ہوگا اور "وطنی قومیت" اور "مسلم قومیت" دونوں کے علمبردار اپنے اپنے مدعا کو پیش کریں گے مگر عملاً یہ یکطرفہ ڈگری ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی پورا پرچہ "وطنی قومیت" کے نمائندوں کے مضامین سے تعمیر ہوا ہے۔ یہ مضامین مسلمان قوم میں "نظریۂ پاکستان" کو ابھارنے والے "سیاسی خوف" کا علاج ایک اور "خوف" ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خوف پاکستان کی مضرتیں گنوا گنوا کر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ نظریۂ پاکستان جس حقیقی خوف کی وجہ سے ابھرا ہے، اس کا ازالہ کسی مثبت تجویز سے ہی ہو سکتا ہے، اور ایسی کسی تجویز کا اس نمبر میں نام و نشان نہیں ملتا۔ بہرحال وطنی قومیت کے بڑے بڑے حامیوں کے خیالات اس میں یکجا ہیں اور کچھ مفید اعداد و شمار بھی دیے گئے ہیں۔

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ	
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-	لائحہ عمل	(زیر طبع)
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت، بناؤ بگاڑ فی	-/۶/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ الف ذیلدار پارک اچھرہ ۔ لاہور (پاکستان)

سرورق مطبوعہ رہبن پریس لاہور